جمادی الآخریٰ ۱۴۳۶ھ
اپریل ۲۰۱۵ء

# ماہنامہ میثاق (لاہور)

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

## حکمت اور بھلائی کے دروازے
”اربعینِ نوویؒ“ کی ایک حدیث کی تفہیم
بانی تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم سُورۃ مریم تا سُورۃ السّجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

ملنے کے پتے

انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
A-18 تا صر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!


# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 64

شمارہ : 4

جُمادی الاُخریٰ 1436ھ

اپریل 2015ء

فی شمارہ -/30



مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر


سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور


مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ




# مشمولات


- **عرضِ احوال** — 5
  - ۲۳ مارچ: یومِ پاکستان یا یومِ جمہوریہ؟ — ایوب بیگ مرزا
- **بیانُ القُرآن** — 9
  - سورۃ طٰہٰ (آیات ۵۶ تا ۹۸) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **مطالعۂ حدیث** — 28
  - ابوابِ خیر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **تعمیرِ سیرت** — 49
  - تزکیۂ نفس — جناب احمد جاوید
- **در دلِ مسلم** — 65
  - حُبِ رسول ﷺ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
- **توضیح و تنقیح** — 73
  - اسلامی ریاست کا تصور، غیر مسلموں پر ظلم! — حامد کمال الدین
- **سیرت و سوانح** — 79
  - عبداللہ بن مبارکؒ — عبدالرشید عراقی
- **اصلاحِ معاشرہ** — 85
  - لڑکی کا علیحدہ گھر کا مطالبہ — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق
- **بحث و نظر** — 94
  - ذوالقرنین، سدِّ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج (۷) — شاہین عطر جنجوعہ


❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

# ۲۳ مارچ: یومِ پاکستان یا یومِ جمہوریہ؟

۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد اجلاس میں علامہ اقبال نے صدارتی خطبہ کے دوران یہ الہامی جملہ ارشاد فرمایا کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک اسلامی ریاست کا قیام تقدیرِ مبرم ہے۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس خطبہ نے مسلمانانِ ہند کو جگا دیا اور انہوں نے اس ریاست کے قیام کے لیے کوششیں شروع کر دیں' البتہ سیاسی حلقوں میں یہ خطبہ گفتگو کا جزو بن گیا اور پھر جلد ہی چوہدری رحمت الٰہی نے اس اسلامی ریاست کو ''پاکستان'' کا نام دے دیا' لیکن مسلم لیگ کا حال یہ تھا کہ وہ اس اسلامی ریاست کے لیے ابھی یکسو نہیں ہوئی تھی اور ایک عرصہ تک مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان بطور مطالبہ کھلم کھلا انداز میں سامنے نہیں آیا تھا' البتہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی و دیگر حقوق کی بات مسلم لیگ بڑے زور و شور سے کر رہی تھی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ہندوستان کے تمام گیارہ صوبوں میں کانگریس حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ ان کانگرسی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اور جس بری طرح مسلمانوں کو نظر انداز کیا اُس نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے باوجود ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک لاہور میں مسلم لیگ کے جلسہ عام میں منظور ہونے والی قراردادِ لاہور میں ''پاکستان'' کا ذکر نہیں تھا' بلکہ اس میں Muslim States کے الفاظ استعمال ہوئے' یعنی برصغیر ہند میں جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں آباد ہیں ان علاقوں پر مشتمل آزاد مسلمان ریاستیں قائم کر دی جائیں۔ متعصب ہندو پریس نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری اور اس قرارداد پر تعصب اور غضب کا اظہار کرتے ہوئے اور مسلم اور غیر مسلم اینٹی پاکستان طبقات کو جھنجھوڑنے کے لیے اگلے روز اس قرارداد کو ''قراردادِ پاکستان'' قرار دے دیا۔ اس پر مسلم لیگ کے ردِعمل کو اگر الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو وہ کچھ یوں تھا کہ ٹھیک ہے یہ قرارداد پاکستان ہی ہے۔ اس حوالہ سے دیکھا جائے تو پاکستان کو مملکت خداداد کہنا یقیناً درست ہے۔



گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ہندو اور اس کی نمائندہ جماعت کانگریس کے تعصب اور تنگ دلی نے تحریک پاکستان کو مہمیز لگائی اور بڑے بڑے جلسہ جلوس سے لے کر گلی محلوں میں مسلمانوں کی اکثریت کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا ''لے کے رہیں گے پاکستان''۔ تحریک پاکستان کے دوران جو دوسرا نعرہ انتہائی مقبول ہوا وہ تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' اگرچہ پاکستان بننے کے ایک عرصہ بعد سردار شوکت حیات جیسے وڈیرے مسلم لیگیوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ نعرہ تو بعض چھوکروں نے لگا دیا تھا' یہ مسلم لیگ کا آفیشل نعرہ نہیں تھا۔ البتہ بعض ذرائع سردار شوکت حیات کے اس دعویٰ کو غلط قرار دیتے ہیں' ان کے مطابق نہ صرف یہ نعرہ بلکہ پوری نظم مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پڑھی گئی تھی۔ بہرحال سوال یہ ہے کہ کبھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس کی تردید ہوئی یا یہ کہا گیا کہ یہ ہمارا آفیشل نعرہ نہیں؟ اسی نعرہ نے تو مسلمانانِ ہند کو تحریک پاکستان کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا تھا۔ پھر یہ کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!'' یہ تو مسلم لیگ کا آفیشل نعرہ تھا۔ سیکولر حضرات غور فرمائیں' دونوں نعروں میں بنیادی فرق کیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد قریباً پونے دو سال تک مسلم لیگ اسلام کے حوالہ سے لیت و لعل سے کام لیتی رہی۔ یعنی ۱۹۴۹ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس دھمکی پر کہ میں عوام میں جاؤں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ مسلم لیگ نے اسلام کے نفاذ کے حوالہ سے عوام سے فراڈ کیا تھا' اسمبلی نے ''قراردادِ مقاصد'' منظور کی' جس پر چند سیکولر ممبران نے یہ تبصرہ کیا کہ اس قرارداد کی منظوری کے بعد ہمارا سر شرم سے جھک گیا ہے' ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے کہ آج کے روشن جمہوری دور میں بھی ہم اللہ کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں! لیکن آج کا سیکولر طبقہ نوٹ کر لے کہ اس دور میں سیکولر طبقہ بھی کم از کم اتنا دیانت دار ضرور تھا کہ اس نے اللہ کے مقتدرِ اعلیٰ قرار دیے جانے پر شرم تو محسوس کی ہے' لیکن یہ نہیں کہا کہ پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانا پاکستان کے معماروں کا مقصد ہی نہیں تھا۔

۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر اُس وقت بھی کی جا چکی تھی۔ قراردادِ مقاصد کی منظوری کے وقت کسی نے اس تقریر کا حوالہ دے کر قرارداد کا راستہ روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ لیکن وقت کی حکومت کی طرف سے اصل فراڈ یہ ہوا کہ یہ قرارداد فائلوں میں دبا دی گئی' اس کو روبہ عمل لانے کی کوشش نہ کی گئی۔ بعض ذرائع کے مطابق لیاقت علی خان کو شہید کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اب قراردادِ مقاصد کو عملاً نافذ کرنے کی طرف پیش رفت کر رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء

تک یہ سرزمین بے آئین رہی۔ ۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی نے اپنے دورِ حکومت کے دوران اس سرزمین کو آئین دیا جو فیڈرل پارلیمانی آئین تھا۔ یہ آئین ۲۳ مارچ کو نافذ ہوا اور اس دن کو ’’یومِ جمہوریہ‘‘ قرار دیا گیا۔ پاکستان کا آئین نافذ ہو جانے کی وجہ سے برطانوی شاہی تخت سے مکمل انقطاع ہو گیا۔ وزیر اعظم کو سربراہِ حکومت اور صدر کو سربراہ ریاست قرار دیا گیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء کو یعنی یومِ جمہوریہ پر آئین ملنے کی خوشی میں ملک بھر میں عام تعطیل ہوئی اور ان دونوں سالوں میں یہ دن بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا‘ اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور آئین کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا۔ اب جب ۱۹۵۹ء میں ۲۳ مارچ کا دن قریب آیا‘ جس روز قوم تعطیل اور جشن منانے کا تصور رکھتی تھی‘ ایوب خان کے لیے مسئلہ بن گیا۔ اس لیے کہ جس آئین کے نفاذ اور ریاست کے جمہوریہ ہونے کا جشن منایا جاتا تھا‘ اب نہ آئین تھا نہ جمہوریت تھی‘ لہٰذا قوم کو کس طرح بہلایا جائے؟ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ’’یومِ جمہوریہ‘‘ کو ’’یومِ پاکستان‘‘ قرار دے کر اس کا تعلق ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کی بجائے ۱۹۴۰ء سے جوڑ دیا گیا‘ لہٰذا قومی تعطیل اور عوامی جشن کے سابقہ انداز کو برقرار رکھا گیا‘ بلکہ منٹو پارک جو اَب اقبال پارک بن چکی تھی‘ وہاں ایک مینار تعمیر کر کے اسے ’’یادگارِ قراردادِ پاکستان‘‘ کا نام دے دیا گیا۔ عوام بے چارے تو بھولے بھی ہوتے ہیں اور جلد بھول بھی جاتے ہیں‘ پھر یہ کہ انہیں کام سے چھٹی اور ہلا گلا کرنے سے تعلق ہوتا ہے‘ وہ ان باریکیوں میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ البتہ آج تک کسی صحافی‘ کسی دانشور نے عوام سے ہونے والے اس فراڈ کو قابلِ ذکر نہیں سمجھا۔ ہماری اس تحقیق کے درست ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک کسی حکومت نے ۲۳ مارچ کو بطور یومِ پاکستان نہیں منایا تھا‘ کبھی قومی سطح پر تعطیل نہیں ہوئی تھی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ چوہدری محمد علی کی حکومت نے آئین کے نفاذ کے لیے ۲۳ مارچ کا دن اس لیے منتخب کر لیا ہو کہ اسی روز ۱۹۴۰ء میں ’’قراردادِ لاہور‘‘ بھی منظور ہوئی تھی۔

اصل میں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان جو اسلام کے نام پر اور جمہوری ذریعہ سے بنا تھا اور شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ اسلام کو پاکستان کا باپ اور جمہوریت کو پاکستان کی ماں قرار دیتے تھے...... لیکن افسوس صد افسوس‘ ہمارے حکمرانوں نے اسلام اور جمہوریت دونوں کے ساتھ فراڈ کیا اور عوام بھی نہ دینی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے



نفاذِ شریعت کے لیے سنجیدگی سے میدان میں نکلے اور نہ ہی جمہوریت ان کے لیے کوئی مسئلہ رہی۔ البتہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے سیاسی وڈیروں نے عوام کو روزمرہ کے مسائل میں اس بری طرح پھنسا دیا تھا اور ہے کہ وہ دو وقت کی روٹی کے چکر سے نکل ہی نہیں پا رہے۔ ہمارا موقف ہے کہ قومیں نعروں سے نہیں‘ عمل سے بنتی ہیں۔ ہم یومِ پاکستان‘ یومِ جمہوریہ یا یومِ آزادی کتنے ہی جوش خروش سے کیوں نہ منائیں اگر ہم پاکستان کو بالفعل اسلامی فلاحی ریاست نہیں بناتے تو پاکستان کا استحکام ہی نہیں پاکستان کی بقا کو بھی خطرہ لاحق رہے گا۔ آج سے چوالیس سال پہلے ۱۹۷۱ء میں ہم اپنا ایک حصہ اس لیے گنوا بیٹھے کہ اسلام کے سیمنٹ سے ہم نے بنگالیوں کو پنجابیوں‘ سندھیوں اور بلوچوں سے جوڑا تھا‘ اس سیمنٹ کو ہم نے پختہ کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا تو اس کا الگ ہونا منطقی تھا‘ اس لیے کہ بنگالیوں کے ساتھ مذہب کے علاوہ ہمارا کچھ مشترک نہیں تھا‘ نہ زبان نہ لباس نہ بودوباش۔ جب ہم نے مذہب کو ریاست سے عملاً الگ رکھا تو وہ ہمارے ساتھ کس بنیاد پر جڑے رہتے؟ آج بھی بلوچستان میں قوم پرستی‘ کراچی میں لسانی فتنہ‘ پٹھانوں کی افغانوں کے ساتھ محبت کی پینگیں صرف اس لیے ہیں کہ ان سب کو جوڑ رکھنے کے لیے مذہب کی بنیاد عملاً موجود نہیں‘ جس سے خلا پیدا ہوا۔ اس خلا کو کہیں قوم پرستی نے اور کہیں لسانی تعصب نے پر کیا۔ ہم سمجھتے ہیں ابھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ اگر ہم اپنی بنیاد پر لوٹ آئیں اور پاکستان میں شریعتِ محمدیؐ کو نافذ کریں تو یہ تعلق پھر پختہ ہو سکتا ہے۔ پاکستانی ایسی خوش قسمت قوم ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت کی بہتری ایک ہی شے سے منسلک ہے۔ اگر ہم اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کریں گے تو ہم میں دنیوی طور پر اتحاد پیدا ہوگا‘ محبتیں بڑھیں گی‘ ملک میں استحکام آئے گا اور خوشحالی آئے گی اور ظاہر ہے آخرت سنوارنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ ممکن ہی نہیں۔ گویا آموں کے آم گٹھلیوں کے دام۔ لیکن اس کے لیے حکمرانوں اور عوام دونوں کو یکسو ہونا پڑے گا اور تحریک پاکستان کے دوران جس پاکستان کا مطلب ’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ بتایا گیا تھا اس میں ’’محمد رسول اللہ‘‘ کا اضافہ کر کے اسے پاکستان کا اوڑھنا بچھونا بنانا ہوگا۔ **وما علینا الا البلاغ!**

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُوْرَةُ طٰهٰ

## آیات ۵۶ تا ۷۶

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۝٥٦ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا
بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝٥٧ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا
نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝٥٨ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ
النَّاسُ ضُحًى ۝٥٩ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝٦٠ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى
وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ
افْتَرٰى ۝٦١ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝٦٢ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ
لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ
الْمُثْلٰى ۝٦٣ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝٦٤
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝٦٥ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ
فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝٦٦ فَاَوْجَسَ فِيْ
نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝٦٧ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝٦٨ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ
تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝٦٩
فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝٧٠ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ
قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ
اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ



وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝٧١ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ
الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا ۝٧٢ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ
وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝٧٣ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا
وَلَا يَحْيٰى ۝٧٤ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ
الْعُلٰى ۝٧٥ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا
مَنْ تَزَكّٰى ۝٧٦

**آیت ۵۶** ﴿وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۝٥٦﴾ ’’اور ہم نے اُس (فرعون) کو دکھا دیں اپنی ساری نشانیاں‘ پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔‘‘

**آیت ۵۷** ﴿قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝٥٧﴾ ’’اُس نے کہا: اے موسیٰؑ! کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو تا کہ اپنے اس جادو کے بل پر ہمیں ہماری سرزمین سے نکال باہر کرو؟‘‘

**آیت ۵۸** ﴿فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ﴾ ’’تو ہم بھی ضرور لائیں گے تمہارے مقابلے میں ایسا ہی جادو‘‘

﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝٥٨﴾ ’’تو معین کر لو ہمارے اور اپنے مابین وعدے کا ایک مقرر وقت‘ نہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے اور نہ تم کرنا (یہ مقابلہ ہو) ایک کھلے میدان میں۔‘‘

ایک کھلے میدان میں ہم سب جمع ہو جائیں۔ وہاں تم بھی اپنی یہ نشانیاں پیش کرو‘ اور ہمارے جادوگر بھی اپنے جادو کے کمالات دکھائیں۔ فرعون کا خیال تھا کہ اس کے بلائے ہوئے جادوگر اس سے بہتر جادو دکھا دیں گے اور اس طرح موسیٰؑ کا دعویٰ باطل ثابت ہو جائے گا۔

**آیت ۵۹** ﴿قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا: تمہارے وعدے کا دن ہو گا جشن کا دن!‘‘

ان کے ہاں یہ کوئی تہوار تھا جس کے سلسلے میں وہ لوگ بڑی تعداد میں کسی میدان میں جمع

ہوکر جشن مناتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکمت سے کام لیتے ہوئے اسی تہوار کے اجتماع کو مقابلے کے لیے مخصوص کرلیا۔

﴿وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾﴾ ’’اور یہ کہ لوگ جمع کر لیے جائیں دن چڑھے۔‘‘

یہ ضحیٰ کا وقت وہی ہے جس وقت ہم عیدین کے موقع پر نماز ادا کرتے ہیں۔ یعنی جب دھوپ ذرا سی اُٹھ جائے اُس وقت لوگوں کو جمع کرلیا جائے۔

**آیت ۶۰** ﴿فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ﴾ ’’تو اب فرعون نے رخ پھیرا‘‘

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ طے ہوگیا تو فرعون نے اپنی پوری توجہ اس کے لیے تیاری کرنے پر مرکوز کردی۔

﴿فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾﴾ ’’چنانچہ اُس نے اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کرلیے‘ پھر وہ (مقابلے میں) آ گیا‘‘

اس نے اپنی پوری مملکت سے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کیا اور یوں پوری تیاری کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے میدان میں اُترا تا کہ ثابت کر سکے کہ آپؑ کا دعویٰ باطل ہے۔

**آیت ۶۱** ﴿قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ﴾ ’’موسیٰؑ نے انہیں (خبردار کرتے ہوئے) کہا: تمہاری بدبختی! اللہ پر جھوٹ مت گھڑو‘ کہ وہ تمہیں غارت کردے کسی عذاب کے ذریعے سے۔‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخری حجت کے طور پر انہیں خبردار کیا کہ دیکھو تم لوگ اللہ پر افترا بازی نہ کرو‘ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں یہ جادو نہیں ہے‘ یہ اللہ کا عطا کردہ معجزہ ہے۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾﴾ ’’اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس کسی نے بھی (اللہ پر) افترا کیا۔‘‘

**آیت ۶۲** ﴿فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾﴾ ’’تو وہ باہم جھگڑ پڑے اپنے اس معاملے میں اور پھر لگے چپکے چپکے مشورہ کرنے۔‘‘

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے براہِ راست جادوگروں سے خطاب کیا تو وہ مرعوب ہوگئے۔



نبوت کا رعب بھی تھا اور آپؑ کی شخصیت کی خداداد وجاہت بھی‘ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد قبل ازیں آیت ۳۹ میں وارد ہو چکا ہے: ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ﴾ کہ میں نے اپنی طرف سے تم پر اپنی خاص محبت ڈال دی تھی۔ چنانچہ جادوگر یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکے۔ آپؑ کی تقریر سنتے ہی مقابلے کا معاملہ ان میں متنازعہ ہوگیا۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کو قائل کرنے کے لیے باہم سرگوشیوں میں مصروف ہوگئے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر سے فرعون کے درباریوں میں باہم اختلاف پیدا ہوگیا اور وہ آپس میں چپکے چپکے سرگوشیاں کرنے لگے کہ یہ مقابلہ نہ کرایا جائے۔ لیکن بالآخر وہ اتفاقِ رائے سے اس نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے:

**آیت ۶۳** ﴿قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾﴾ ’’انہوں نے کہا کہ یہ دونوں جادوگر ہی ہیں‘ جو چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال باہر کریں اپنے جادو (کے زور) سے‘ اور تمہاری مثالی تہذیب کو برباد کردیں۔‘‘

مُثْلٰی مؤنث ہے اَمْثَل کا‘ جس کے معنی ہیں سب سے زیادہ مثالی۔ حق کے مقابلے میں باطل ذہنیت کا باہمی اتفاق ملاحظہ ہو کہ جو دلیل اس وقت فرعون اور اس کے درباریوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سوجھی تھی آج بھی شیطانی قوتیں مسلمانوں کے خلاف اسی دلیل کے تحت پروپیگنڈا کر رہی ہیں۔ ابلیسی سوچ کے نقیبوں نے آج بھی پوری دنیا میں شور برپا کر رکھا ہے کہ Muslim Fundamentalism ہماری مثالی تہذیب وثقافت کے لیے خطرہ ہے۔ ہم نے بڑی محنت سے مختلف اداروں کو فروغ دیا ہے‘ دنیا میں انسانی حقوق کا تصور متعارف کرایا ہے‘ جان جوکھوں میں ڈال کر مرد وزن کی مساوات اور عورتوں کی آزادی کی جنگ لڑی ہے۔ مگر مسلمان بنیاد پرست ہماری تہذیب وثقافت کی ان مثالی achievements کو ملیامیٹ کردینا چاہتے ہیں۔

**آیت ۶۴** ﴿فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ﴾ ’’چنانچہ تم مجتمع کروا اپنی ساری تدبیریں (اور اپنے وسائل وذرائع) پھر آؤ (مقابلہ میں) صف باندھ کر۔‘‘

تم لوگ اپنے تمام دستیاب مادی وفنی وسائل بروئے کار لاتے ہوئے موسیٰؑ کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوجاؤ۔

﴿وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡیَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰی ﴿۶۴﴾﴾ ''اور آج کامیاب وہی رہے گا جو غالب آئے گا۔''

آیت ۶۵ ﴿قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ نَّکُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰی ﴿۶۵﴾﴾
''جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تم پہلے ڈالو اور یا پھر ہم ہی پہلے ڈالنے والے بنتے ہیں۔''

آیت ۶۶ ﴿قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ﴾ ''موسیٰؑ نے کہا: بلکہ تم ہی ڈالو!''

تو یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو پہل کرنے کی دعوت دے دی۔

﴿فَاِذَا حِبَالُہُمۡ وَ عِصِیُّہُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی ﴿۶۶﴾﴾ ''تو دفعتاً ان کی رسیاں اور لاٹھیاں اُن کے جادو کے اثر سے اس کو ایسے نظر آنے لگیں گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔''

حِبال جمع ہے حَبل (رسّی) کی اور عِصِیّ جمع ہے عَصا (لاٹھی) کی۔ یعنی جادوگروں نے میدان میں رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں جو ان کے جادو کے اثر سے دیکھنے والوں کو سانپوں کی طرح بھاگتی دوڑتی نظر آنے لگیں۔

آیت ۶۷ ﴿فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی ﴿۶۷﴾﴾ ''تو موسیٰؑ نے اپنے جی میں کچھ ڈر محسوس کیا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خوف لاحق ہوا کہ جو معجزہ میرے پاس ہے اسی نوعیت کی چیز تو جادوگروں نے بھی دکھا دی ہے۔ چنانچہ اب یہ سارے تماشائی تالیاں پیٹیں گے کہ موسیٰ کو شکست ہوگئی اور وہ جو عظیم الشان مشن اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کیا ہے اس کا کیا بنے گا؟

آیت ۶۸ ﴿قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰی ﴿۶۸﴾﴾ ''ہم نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔''

آیت ۶۹ ﴿وَ اَلۡقِ مَا فِیۡ یَمِیۡنِکَ تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوۡا کَیۡدُ سٰحِرٍ ؕ﴾
''اب تم ذرا پھینکو اس (عصا) کو جو تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے، یہ نگل جائے گا اس سب کو جو کچھ انہوں نے بنایا ہے۔ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے یہ تو بس ایک فریب ہے جادوگر کا۔''



یعنی یہ جو کچھ میدان میں سانپوں کی صورت میں نظر آ رہا ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں، محض نظر کا دھوکا ہے۔ عرفِ عام میں اس کیفیت کو ''نظر بندی'' کہا جاتا ہے۔

﴿وَ لَا یُفۡلِحُ السّٰحِرُ حَیۡثُ اَتٰی ﴿۶۹﴾﴾ ''اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتا، چاہے کہیں سے بھی آئے۔''

آیت ۷۰ ﴿فَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سُجَّدًا﴾ ''پس گرا دیے گئے جادوگر سجدے میں''

اس نکتے کی وضاحت سورۃ الاعراف کے مطالعہ کے دوران کی جا چکی ہے کہ آخر کیا وجہ تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فتح کے بعد جادوگر تو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے، لیکن دوسری طرف نہ فرعون پر اس کا کچھ اثر ہوا اور نہ ہی اس کے درباریوں سمیت دوسرے لوگوں پر۔ دراصل فرعون اور اس کے درباریوں نے تو یہی سمجھا کہ یہ جادوگروں کا آپس میں مقابلہ تھا جس میں بڑے جادوگر نے چھوٹے جادوگروں کو مات دے دی۔ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل جادوگر جو اپنے فن کے ماہر تھے وہ اپنے کمالِ فن کی انتہا سے بھی آگاہ تھے اور اس کی حدود (limits) سے بھی خوب واقف تھے۔ جیسے آج ایک طبیعیات دان (Physicist) خوب جانتا ہے کہ فزکس کے میدان میں اب تک کیا کیا ایجادات ہو چکی ہیں اور اس کے کمالات کی رسائی کہاں تک ہے۔ چنانچہ جادوگروں پر یہ حقیقت منکشف ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ نہ تو ان کے مدمقابل شخصیت کوئی جادوگر ہے اور نہ ہی یہ اژدھا کسی جادوئی کرشمے کا کمال ہے! چنانچہ وہ بغیر حیل و حجت سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے اور:

﴿قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ ہٰرُوۡنَ وَ مُوۡسٰی ﴿۷۰﴾﴾ ''وہ پکار اٹھے کہ ہم ایمان لے آئے ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر۔''

آیت ۷۱ ﴿قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَہٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ ؕ﴾ ''فرعون نے کہا: (تو کیا) تم اس پر ایمان لے آئے ہو اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دیتا!''

فرعون نے مخصوص شہنشاہانہ انداز میں جادوگروں کو ڈانٹ پلائی کہ تمہاری یہ جرأت! تم لوگوں نے مابدولت کی اجازت کے بغیر موسیٰ کے رب پر ایمان لانے کا اعلان بھی کر دیا! حالانکہ میری اجازت کے بغیر تو اس کے بارے میں تمہیں زبان بھی نہیں کھولنا چاہیے تھی۔

﴿اِنَّہٗ لَکَبِیۡرُکُمُ الَّذِیۡ عَلَّمَکُمُ السِّحۡرَ ۚ﴾ ''یقیناً یہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔''

اب فرعون کو ایک اور چال سوجھی۔ جس طرح عزیز مصر کی بیوی نے اپنے خاوند کو سامنے دروازے پر دیکھ کر یکدم پینترا بدلا تھا اور موقف اختیار کیا تھا کہ یوسف اس کی آبرو کے درپے ہوا تھا‘ اسی طرح فرعون نے جادوگروں کو مخاطب ہو کر کہا کہ تم لوگوں نے جو مقابلہ کیا ہے یہ محض دکھاوا تھا۔ موسیٰ دراصل تمہارا استاد ہے‘ تم لوگوں نے اسی سے جادو سیکھ رکھا ہے۔ اندر سے تم لوگ آپس میں ملے ہوئے ہو۔ تمہاری یہ شکست تم لوگوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے اور اس طرح تم لوگوں نے مل ملا کر ہمارے خلاف ایک بہت بڑی سازش کی ہے۔ چنانچہ اس نے گرجتے ہوئے جادوگروں کو دھمکی دی:

﴿فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَاَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّکُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۫﴾ ”تو میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالوں گا‘ اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی (دے کر لٹکا) دوں گا۔“

﴿وَلَتَعۡلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰی ﴿۷۱﴾﴾ ”اور یقیناً تمہیں (جلد) معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت سزا دینے والا ہے اور کون زیادہ باقی رہنے والا ہے۔“

تم لوگوں کو میرے اور موسیٰ کے اختیار و مرتبے کا فرق بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت سزا دے سکتا ہے اور کس کو بقاء و دوام حاصل ہے۔

**آیت ۷۲** ﴿قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالَّذِیۡ فَطَرَنَا﴾ ”انہوں نے کہا: اب ہم تمہیں ہرگز ترجیح نہیں دے سکتے ان واضح دلائل پر جو ہمارے پاس آ چکے ہیں اور اُس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے“

اب ہمارے رب کی طرف سے ہم پر حق واضح کر دیا گیا ہے‘ حقیقت ہم پر منکشف ہو چکی ہے‘ ہم اپنے رب پر ایمان لا چکے ہیں‘ اب ہمارے لیے تیری مرضی ومنشا کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

﴿فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ﴾ ”چنانچہ تو کر لے جو کچھ تجھے کرنا ہے۔“

اب تو ہمیں جو سزا دینا چاہے دے لے‘ خواہ ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کر دے‘ مگر ہم جس حق پر ایمان لائے ہیں اب اس سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔

﴿اِنَّمَا تَقۡضِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿۷۲﴾﴾ ”تُو تو صرف فیصلہ کر سکتا ہے اسی دنیا کی زندگی کا۔“



تو ہمارے ساتھ زیادہ سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے؟ صرف ہماری اس دُنیوی زندگی ہی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہے نا! جو آج نہیں تو کل‘ کل نہیں تو پرسوں ویسے بھی ختم ہونے والی ہے۔ اگر تو اسے کل کے بجائے آج ختم کر دے گا تو اس میں ہمارے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں:

**آیت ۷۳** ﴿اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَاۤ اَکۡرَہۡتَنَا عَلَیۡہِ مِنَ السِّحۡرِ ؕ﴾ ”ہم اپنے رب پر ایمان لا چکے ہیں‘ تا کہ وہ بخش دے ہماری خطاؤں کو اور اس جادو کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا۔“

تیرے مجبور کرنے پر ہم نے اپنے جادو کے بل پر اللہ کے پیغمبر علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کی جو جسارت کی ہے ہم اپنے رب سے اس جرم کی معافی مانگتے ہیں۔ ان جادوگروں سے تو یہی کہا گیا ہو گا کہ تمہیں ایک بہت بڑے جادوگر کا مقابلہ کرنا ہے‘ لیکن جب یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تو آپؑ کی بارعب شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور مقابلہ کرنے کے بارے میں تذبذب کا شکار ہو گئے۔ قبل ازیں آیت ۶۲ میں ان کی اس کیفیت کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ اب جادوگروں کے اس اقراری بیان سے مزید واضح ہو گیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ لینے اور آپؑ کی تقریر سن لینے کے بعد آپؑ سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتے تھے‘ لیکن بالآخر فرعون کے مجبور کرنے پر وہ اس پر آمادہ ہو گئے تھے۔

﴿وَاللّٰہُ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی ﴿۷۳﴾﴾ ”اور اللہ ہی بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔“

حق کو قبول کر لینے اور اللہ پر ایمان لا چکنے کے بعد اب ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ بقاء و دوام صرف اللہ ہی کو حاصل ہے اور اسی کا راستہ سب سے بہتر راستہ ہے۔

**آیت ۷۴** ﴿اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ ؕ لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَلَا یَحۡیٰی ﴿۷۴﴾﴾ ”یقیناً جو کوئی آئے گا اپنے رب کے پاس مجرم کی حیثیت سے تو اس کے لیے جہنم ہی ہے‘ نہ وہ اس میں مرے گا اور نہ ہی جیے گا۔“

**آیت ۷۵** ﴿وَمَنۡ یَّاۡتِہٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَہُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰی ﴿۷۵﴾﴾ ”اور جو کوئی آئے گا اس کے پاس مؤمن کی حیثیت سے (اور اس حالت میں کہ) اس نے نیک اعمال بھی کیے ہوں‘ تو یہ لوگ ہیں جن کے لیے اعلیٰ درجات ہوں گے۔“

یعنی ایسے لوگ جن کے پاس ایمانِ حقیقی کے ساتھ ساتھ نیک اعمال کی پونجی بھی ہوگی ان کے لیے بلند درجے ہوں گے۔

**آیت ۷۶** ﴿جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ﴾ ''رہنے کے ایسے باغات جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی' وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَكّٰی ﴿۷۶﴾﴾ ''اور یہی بدلہ ہے اُس کا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا۔''

# آیات ۷۷ تا ۸۹

وَلَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی ۙ۬ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ
یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخۡشٰی ﴿۷۷﴾ فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِهٖ فَغَشِیَهُمۡ مِّنَ
الۡیَمِّ مَا غَشِیَهُمۡ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهٗ وَمَا هَدٰی ﴿۷۹﴾ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ قَدۡ
اَنۡجَیۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَوٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنَ وَنَزَّلۡنَا عَلَیۡكُمُ الۡمَنَّ
وَالسَّلۡوٰی ﴿۸۰﴾ كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَلَا تَطۡغَوۡا فِیۡهِ فَیَحِلَّ عَلَیۡكُمۡ
غَضَبِیۡ ۚ وَمَنۡ یَّحۡلِلۡ عَلَیۡهِ غَضَبِیۡ فَقَدۡ هَوٰی ﴿۸۱﴾ وَاِنِّیۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ
وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهۡتَدٰی ﴿۸۲﴾ وَمَاۤ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ یٰمُوۡسٰی ﴿۸۳﴾ قَالَ
هُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیۡ وَعَجِلۡتُ اِلَیۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰی ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ
مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوۡسٰۤی اِلٰی قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ
اَسِفًا ۚ قَالَ یٰقَوۡمِ اَلَمۡ یَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَیۡكُمُ الۡعَهۡدُ اَمۡ
اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ یَّحِلَّ عَلَیۡكُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِیۡ ﴿۸۶﴾ قَالُوۡا مَاۤ
اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلۡنَاۤ اَوۡزَارًا مِّنۡ زِیۡنَةِ الۡقَوۡمِ فَقَذَفۡنٰهَا
فَكَذٰلِكَ اَلۡقَی السَّامِرِیُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوۡا هٰذَاۤ
اِلٰهُكُمۡ وَاِلٰهُ مُوۡسٰی ۬ فَنَسِیَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا یَرَوۡنَ اَلَّا یَرۡجِعُ اِلَیۡهِمۡ قَوۡلًا ۬ۙ وَّلَا یَمۡلِكُ
لَهُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ﴿۸۹﴾



**آیت ۷۷** ﴿وَلَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی ۙ۬ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو وحی کر دی تھی کہ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ''

ان کے مصر سے نکلنے کے لیے ایک رات کا مخصوص وقت طے کر دیا گیا تھا کہ اس رات جب قبطی لوگ اپنے اپنے گھروں میں نیند کے مزے لے رہے ہوں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام اسرائیلیوں کو لے کر چپکے سے صحرائے سینا کی طرف نکل کھڑے ہوں۔

﴿فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا ۙ﴾ ''پس ان کے لیے سمندر کے اندر ایک خشک راستہ بنا لو'

﴿لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخۡشٰی ﴿۷۷﴾﴾ ''(اس کیفیت میں کہ) نہ پکڑے جانے کا خوف ہو اور نہ (ڈوبنے کا) کوئی اندیشہ۔''

**آیت ۷۸** ﴿فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِهٖ فَغَشِیَهُمۡ مِّنَ الۡیَمِّ مَا غَشِیَهُمۡ ﴿۷۸﴾﴾ ''تو فرعون نے ان کا تعاقب کیا اپنے لشکروں کے ساتھ' تو ڈھانپ لیا انہیں سمندر میں سے جس چیز نے بھی ڈھانپ لیا۔''

اس کی تفصیل قرآن میں دوسرے مقامات پر موجود ہے' یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے سمندر پر عصا مارا۔ اس سے سمندر پھٹ گیا' دونوں طرف کا پانی بڑی بڑی چٹانوں کی طرح [كَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۶۳﴾ (الشعراء)] کھڑا ہو گیا اور درمیان میں خشک راستہ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس راستے سے اپنی قوم کو لے کر نکل گئے۔ لیکن جب فرعون اپنے لشکروں سمیت اس میں داخل ہوا تو دونوں طرف کا پانی مل گیا اور اس طرح سے وہ سب کے سب غرق ہو گئے۔

**آیت ۷۹** ﴿وَاَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهٗ وَمَا هَدٰی ﴿۷۹﴾﴾ ''اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ہدایت نہ دی۔''

**آیت ۸۰** ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ قَدۡ اَنۡجَیۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَوٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنَ﴾ ''اے بنی اسرائیل! ہم نے تم لوگوں کو نجات دی تمہارے دشمن سے' پھر ہم نے تم لوگوں کو بلایا کوہِ طور کی داہنی جانب''

یہ اسی مقام کا ذکر ہے جہاں پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا۔

﴿وَنَزَّلۡنَا عَلَیۡكُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی ﴿۸۰﴾﴾ ''اور (صحرا میں تمہاری غذا کے لیے) تم

پر من وسلویٰ نازل کیا۔‘‘

**آیت ۸۱** ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ﴾ ’’کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں اور اس میں زیادتی نہ کرنا‘‘

لیکن منع کرنے کے باوجود بنی اسرائیل نے اس معاملے میں زیادتی کی۔ زیادتی کی ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ اسے سینت سینت کر رکھتے تھے‘ اس خدشے سے کہ شاید کل یہ نازل نہ ہو اور یوں توکل علی اللہ کی نفی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس میں اس طرح بھی زیادتی کی کہ کچھ ہی عرصہ بعد اس کی ناقدری کرتے ہوئے اس کے مقابلے میں دوسری چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔

﴿فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝۸۱﴾ ’’تو (ایسی صورت میں) تم پر میرا غضب نازل ہوگا‘ اور جس پر میرا غضب نازل ہو جائے تو وہ (گویا) پٹخ دیا گیا۔‘‘

**آیت ۸۲** ﴿وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝۸۲﴾ ’’اور میں تو یقیناً بہت ہی معاف فرمانے والا ہوں ہر اُس شخص کے لیے جس نے توبہ کی‘ ایمان لایا‘ نیک اعمال کیے‘ اور پھر سیدھی راہ پر چلتا رہا۔‘‘

**آیت ۸۳** ﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝۸۳﴾ ’’اور اے موسیٰؑ! یہ تمہیں کس چیز نے جلدی پر آمادہ کیا اپنی قوم کو چھوڑ کر؟‘‘

اس سے پہلے سورۂ مریم کی آیت ۶۴ اور آیت ۸۴ میں عجلت سے منع کیا جا چکا ہے۔ آیت ۶۴ میں حضور ﷺ کو بالواسطہ انداز میں فرمایا گیا کہ آپ ﷺ وحی کے جلد آنے کے بارے میں خواہش نہ کیا کریں‘ کیونکہ یہ تو اللہ کی مشیت کے مطابق ہی نازل ہوگی۔ چنانچہ فرشتے کی زبان سے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کہلوایا گیا: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ﴾ کہ ہم تو آپؐ کے رب کے حکم سے ہی نازل ہوتے ہیں۔ جبکہ آیت ۸۴ میں آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ’’تو آپؐ ان پر (عذاب کے بارے میں) جلدی نہ کریں‘‘۔ اب آیت زیر نظر میں جلدی کرنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جواب طلبی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو تورات دینے کے لیے ایک معین وقت پر کوہِ طور پر بلایا تو آپؑ فرطِ اشتیاق سے



قبل از وقت وہاں پہنچ گئے۔ اس پر آپؑ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی قوم کو پیچھے چھوڑ کر وقت سے پہلے یہاں کیوں آ گئے ہیں؟

**آیت ۸۴** ﴿قَالَ هُمْ اُولَاۗءِ عَلٰٓي اَثَرِيْ﴾ ’’موسیٰؑ نے عرض کیا کہ بس وہ میرے پیچھے پیچھے ہی (آ رہے) ہیں‘‘

آپؑ کی قوم کا قافلہ تو معمول کی رفتار سے آ رہا ہوگا اور آپؑ اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور مکالمے کے شوق میں تیز رفتاری سے سفر طے کرتے ہوئے وقت مقررہ سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ آپؑ نے اس کی وجہ بھی یہی بتائی:

﴿وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝۸۴﴾ ’’اور اے میرے پروردگار! میں نے تو تیری طرف (آنے میں اس لیے) جلدی کی تاکہ تُو راضی ہو جائے۔‘‘

گویا اللہ تعالیٰ کے حضور آپؑ فرطِ جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ اقبال کے مصرع میں ذرا تصرف کے ساتھ ’’تُو میرا شوق دیکھ مرا اشتیاق دیکھ!‘‘ والی کیفیت تھی۔ آپؑ کا خیال تھا اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے اور شاباش ملے گی‘ مگر یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے‘ الٹی explanation call ہو گئی۔

**آیت ۸۵** ﴿قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ﴾ ’’اللہ نے فرمایا: تو ہم نے تمہارے بعد تمہاری قوم کو فتنے میں ڈال دیا ہے‘‘

اگرچہ یہاں صراحت کے ساتھ ایسے الفاظ استعمال نہیں ہوئے مگر انداز سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی اس عجلت پسندی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی قوم کو فتنے میں مبتلا کر دیا۔

﴿وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝۸۵﴾ ’’اور انہیں گمراہ کر دیا ہے سامری نے۔‘‘

اس اندازِ تخاطب میں یہ تفصیل بھی مضمر ہے کہ اگر آپؑ اپنی قوم کے ساتھ ساتھ رہتے‘ ان کا تزکیہ کرتے رہتے‘ وہ لوگ آپؑ کی تعلیم و تربیت سے مسلسل بہرہ مند ہوتے رہتے تو یقیناً ان کی عقل و فہم مزید پختہ ہوتی اور اس طرح اس فتنے کی نوبت نہ آتی۔ لیکن جب آپؑ انہیں چھوڑ کر آ گئے تو اس کے نتیجے میں ایک فتنہ گر شخص کو اپنا شیطانی کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

سامری کے بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اس کا تعلق قبطی قوم سے تھا اور کسی وجہ سے وہ بنی اسرائیل کے ساتھ مل چکا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں معتبر رائے یہی ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں

سے ہی تھا مگر منافق تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اسے خاص کد تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ابو عامر راہب کو حضور ﷺ سے کد تھی۔ ابو عامر راہب کا ذکر سورۃ التوبہ کے مطالعے کے دوران آیا تھا۔ بنیادی طور پر وہ خزرجی تھا۔ ابتدائی عمر میں بہت نیک اور عبادت گزار تھا' بعد میں اس نے عیسائیت قبول کر کے رہبانیت اختیار کر لی۔ حضور ﷺ سے اسے خصوصی طور پر بغض تھا اور اس کا یہ بغض اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنی ساری زندگی آپؐ کے خلاف جدّوجُہد اور سازشوں میں مصروف رہا۔ چنانچہ جیسا کردار ابو عامر راہب کا اُمتِ محمد ﷺ میں رہا' اس سے ملتا جلتا کردار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت میں سامری کا تھا۔

**آیت ۸۶** ﴿فَرَجَعَ مُوْسٰۤی اِلٰی قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ﴾ ''تو لوٹے موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف بہت غضبناک اور سخت رنجیدہ حالت میں۔''

﴿قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! کیا تم سے تمہارے رب نے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟''

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تم لوگوں کو اپنی کتاب کی صورت میں جامع ہدایت عطا فرمائے گا۔ میں تو اللہ کے اس وعدے کے مطابق طور پر گیا تھا کہ تمہارے لیے اس کی کتاب اور ہدایت لے کر آؤں:

﴿اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ﴾ ''تو کیا یہ مدت تم پر بہت طویل ہو گئی تھی؟''

﴿اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ ۸۶﴾ ''یا تم لوگوں نے یہ چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو' تو تم نے میرے وعدے کی خلاف ورزی کر ڈالی۔''

گویا تمہاری یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

**آیت ۸۷** ﴿قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا﴾ ''انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپ کے وعدے کی خلاف ورزی اپنے اختیار سے نہیں کی''

﴿وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَی السَّامِرِیُّ ۸۷﴾ ''بلکہ ہم پر بوجھ تھا اس قوم کے زیورات کا' تو ہم نے وہ پھینک دیے' اور



اسی طرح سامری نے بھی کچھ پھینکا۔''

**آیت ۸۸** ﴿فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ﴾ ''پھر اُس نے ان کے لیے ایک بچھڑا برآمد کر دیا' ایک دھڑ جس سے ڈکرانے کی آواز آتی تھی۔''

اس سلسلے میں جو مختلف روایات ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مصر میں اگرچہ اسرائیلی قوم کی حیثیت غلامانہ تھی مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تعلق کی وجہ سے ان کی دیانت داری مسلّم تھی۔ چنانچہ قبطی قوم کے لوگ اپنے زیورات اور دوسری قیمتی چیزیں اکثر ان کے پاس امانت رکھوایا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ مصر سے نکلے تو قبطی قوم کے بہت سے زیورات بھی وہ اپنے ساتھ لے آئے جو ان میں سے اکثر لوگوں کے پاس بطور امانت پڑے تھے۔ البتہ اس کا ان کے ذہن پر ایک بوجھ تھا کہ یہ ہمارے لیے جائز بھی ہیں یا نہیں؟ اس حوالے سے سامری نے بھی انہیں قائل کر لیا کہ اس بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کو یہ زیورات پھینک دینے چاہئیں۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے وہ زیوارت پھینک دیے تو سامری نے انہیں پگھلا کر گائے کے بچھڑے کی شکل کا ایک مجسمہ بنا ڈالا' اور اس میں خاص مہارت سے کچھ ایسے سوراخ رکھے کہ جب ان میں سے ہوا کا گزر ہوتا تو بیل کے ڈکرانے کی سی آواز پیدا ہوتی۔ اس کی دوسری توجیہہ وہ ہے جو سامری نے خود بیان کی اور اس کا ذکر آئندہ آیات میں آئے گا۔

﴿فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰی فَنَسِیَ ۸۸﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ یہ ہے تمہارا معبود اور موسیٰؑ کا معبود' مگر وہ (موسیٰؑ) بھول گیا ہے۔''

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مغالطہ ہوا ہے جو وہؑ اپنے رب سے ملاقات کے لیے کوہِ طور پر چلے گئے ہیں' حالانکہ ہمارا اور انؑ کا رب تو یہاں موجود ہے۔

**آیت ۸۹** ﴿اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ﴾ ''تو کیا وہ دیکھتے نہیں تھے کہ وہ (بچھڑا) ان کی طرف کوئی بات لوٹاتا نہیں تھا''

کیا انہیں نظر نہیں آتا تھا کہ وہ بچھڑا ان کی کسی بات کو جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس میں سے تو ایک بے معنی بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور بس!

﴿وَّلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۸۹﴾ ''اور نہ ہی اسے ان کے لیے کسی نقصان کا اختیار تھا اور نہ نفع کا۔''

# آیات ۹۰ تا ۹۸

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ
فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا
مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ
اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ
فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾
قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا
وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا
مِسَاسَ ۠ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ
عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

**آیت ۹۰** ﴿وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ﴾ ’’اور ہارونؑ انہیں پہلے ہی کہہ چکا تھا‘‘

حضرت ہارون علیہ السلام ان لوگوں کو پہلے ہی ان الفاظ میں سمجھانے کی پوری کوشش کر چکے تھے:

﴿يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ﴾ ’’اے میری قوم کے لوگو! تمہیں تو اس (بچھڑے) کے ذریعے سے فتنے میں ڈالا گیا ہے۔‘‘

﴿وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾﴾ ’’اور یقیناً تمہارا رب (یہ بچھڑا نہیں بلکہ) رحمٰن ہے‘ چنانچہ تم لوگ میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔‘‘

**آیت ۹۱** ﴿قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾﴾ ’’انہوں نے کہا: ہم تو اسی پر اعتکاف کرتے رہیں گے‘ یہاں تک کہ موسیٰؑ خود ہمارے پاس واپس آ جائیں۔‘‘

یہ جواب پوری بنی اسرائیل قوم کی طرف سے نہیں تھا بلکہ صرف ان لوگوں کی طرف سے تھا جو ان میں سے بچھڑا پرستی کے مشرکانہ عقیدے میں مبتلا ہوئے تھے اور پھر اس پر اڑ گئے تھے۔



انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو جواب دیا کہ ہم تو اب اسی کی پرستش کرتے رہیں گے‘ یہاں تک کہ موسیٰؑ خود آ کر اس بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ یہ لوگ اس سے پہلے بھی ایک بت پرست قوم کی دیکھا دیکھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کر چکے تھے (الاعراف: ۱۳۸) کہ ان لوگوں کے بتوں جیسا ہمیں بھی کوئی معبود بنا دیں جس کے سامنے بیٹھ کر ہم پوجا پاٹ کر سکیں۔

**آیت ۹۲** ﴿قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا: اے ہارون! آپؑ کو کس چیز نے روکا تھا جب آپؑ نے انہیں دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں۔‘‘

**آیت ۹۳** ﴿اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ﴾ ’’کہ آپؑ نے میری پیروی نہ کی؟‘‘

اس کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے ’’جو آپ میرے پیچھے نہ آ گئے‘‘۔ یعنی آپؑ میرے پیچھے کوہِ طور پر کیوں نہ آ گئے اور آ کر کیوں نہ مجھے بتایا کہ وہ لوگ یوں گمراہ ہو گئے ہیں۔

﴿اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾﴾ ’’یا پھر آپؑ نے نافرمانی کی میرے حکم کی؟‘‘

اگرچہ عمر میں حضرت ہارون علیہ السلام بڑے تھے مگر منصب نبوت کے اعتبار سے چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رتبہ ان سے بڑا تھا اس لیے آپؑ نے اس انداز میں حضرت ہارونؑ سے جواب طلبی کی۔

**آیت ۹۴** ﴿قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ﴾ ’’ہارونؑ نے کہا: اے میری ماں کے بیٹے! آپؑ (اس طرح) میری ڈاڑھی اور میرے سر (کے بالوں) کو مت کھینچیں!‘‘

﴿اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ﴾ ’’مجھے تو یہ اندیشہ تھا کہ آپؑ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفریق پیدا کر دی‘‘

کہ تم نے ان کو تقسیم کر کے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔

﴿وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾﴾ ’’اور میری بات یاد نہ رکھی۔‘‘

حضرت ہارون علیہ السلام سے باز پرس کرنے کے بعد اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے جواب طلب کیا۔

**آیت ۹۵** ﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا: اے سامری! تمہارا کیا معاملہ ہے؟‘‘

**آیت ۹۶** ﴿قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ﴾ ’’اُس نے کہا کہ میں نے (ایک ایسی چیز) دیکھی تھی جو انہوں نے نہیں دیکھی‘‘

﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا﴾ ’’تو میں نے لے لی ایک مٹھی (مٹی کی) رسول کے نقشِ پا سے‘ تو وہ میں نے (اس میں) پھینک دی‘‘

﴿وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۹۶﴾ ’’اور اسی طرح میرے نفس نے یہ راستہ مجھے بتایا‘‘

رسول سے مراد یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت جبرائیلؑ کہیں حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے تھے تو سامری نے انہیں دیکھ لیا۔ سامری چونکہ راہب تھا‘ وہ روحانی اور نفسیاتی نوعیت کے مجاہدے بھی کرتا رہتا تھا۔ اس لیے حضرت جبرائیل کسی اور کو تو نظر نہ آئے مگر اسے نظر آ گئے۔ زمین پر جہاں آپؑ کا قدم پڑ رہا تھا وہاں سے اس نے کچھ مٹی اٹھا لی۔ یہی مٹی اس نے اس بھٹی میں ڈال دی جس میں وہ بچھڑا تیار کرنے کے لیے زیورات کو پگھلا رہا تھا۔ یوں حضرت روح الامینؑ کے قدموں کی مٹی کی تاثیر سے اس بچھڑے سے وہ آواز آنے لگی۔ یہ گویا اس معاملے کے بارے میں سامری کی وضاحت ہے۔

**آیت ۹۷** ﴿قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا: دفع ہو جاؤ! اب تمہارے لیے زندگی میں یہی (سزا) ہے کہ تم کہتے رہو گے کہ مجھے کوئی نہ چھوئے۔‘‘

سامری بطور سزا جس بیماری میں مبتلا کیا گیا تھا اس کی تفصیل تو نہیں ملتی مگر ان الفاظ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ عملاً وہ اچھوت بن کر رہ گیا تھا۔ نہ وہ کسی کے قریب جا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص اس کے پاس آ سکتا تھا۔ بعض روایات میں اس طرح کی تفصیلات ملتی ہیں کہ اگر کوئی شخص اس کے قریب جاتا تو دونوں سخت بخار میں مبتلا ہو جاتے تھے اور یوں باقی تمام زندگی اسے معاشرتی مقاطعہ کی سزا بھگتنا پڑی۔

﴿وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ﴾ ’’اور تمہارے لیے ایک وعدہ ہے جس کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔‘‘

﴿وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا﴾ ’’اور دیکھو اپنے اس معبود کو جس کا تم اعتکاف کرتے رہے ہو (ہم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں!)‘‘

﴿لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۹۷﴾ ’’ہم اسے جلا (کر راکھ کر) دیں



گے‘ پھر اس (کی راکھ) کو سمندر میں بکھیر دیں گے۔‘‘

**آیت ۹۸** ﴿اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ’’حقیقت میں تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے‘ جس کے سوا کوئی اور معبود ہے ہی نہیں۔‘‘

﴿وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۹۸﴾ ’’اُسے ہر چیز کا علم حاصل ہے۔‘‘

اسرائیلی قوم کے بگڑے ہوئے عقائد اور ان کی عمومی ذہنیت کی جو تفصیلات ہمیں قرآن سے ملتی ہیں اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہندو برہمن کی سوچ‘ ذہنیت اور عقائد کی اس سے بہت قریبی مشابہت نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں میری ذاتی رائے ہے کہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل (چودہ سو سال قبل مسیح) کے لگ بھگ جب آریا نسل کے لوگ ہندوستان کی طرف محوِ سفر تھے تو ان کے ساتھ کسی مقام پر کچھ اسرائیلی قبائل بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب مصر سے بنی اسرائیل کا خروج (Exodus) ہوا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں ان کے کچھ ایسے قبائل کا ذکر ملتا ہے جنہیں وہ اپنے گم شدہ قبائل (The lost tribes of the house of Israel) کہتے ہیں۔ یہ وہ قبائل ہیں جو صحرا میں گم ہو گئے تھے اور ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں چلے گئے۔ میرے خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے وہ گم شدہ قبائل کسی نہ کسی طرح آریاؤں (آریا لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت حام کی نسل سے تھے) کے ان گروہوں سے آ ملے تھے جو اس زمانے میں ہندوستان کی طرف کوچ کر رہے تھے اور اس طرح آریاؤں کے ساتھ وہ لوگ بھی ہندوستان میں آ بسے تھے۔ اس سلسلے میں میرا گمان یہ ہے کہ ہندو برہمن انہی اسرائیلیوں کی نسل سے ہیں۔

میرے اس گمان کی بنیاد ہندوؤں اور اسرائیلیوں کے رسم و رواج اور عقائد میں پائی جانے والی گہری مشابہت ہے۔ مثلاً جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ کو سمندر میں بہایا تھا‘ بالکل اسی طرح ہندو اپنے مردوں کو جلا کر ان کی راکھ کو گنگا وغیرہ میں بہاتے ہیں۔ اسرائیلیوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنایا تھا‘ ہندو بھی مذہبی طور پر گائے کو مقدس مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو روایتی طور پر اپنے لیے وہی شوخ یا زرد گیروا رنگ پسند کرتے ہیں جو قرآن میں بنی اسرائیل کے لیے مخصوص گائے کا رنگ بتایا گیا ہے (البقرۃ:۶۹)۔ پھر سامری کے اچھوت ہو جانے کے تصور کو بھی ہندوؤں نے بعینہٖ اپنایا اور اس کے تحت اپنے معاشرے کے ایک طبقے کو اچھوت قرار دے ڈالا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ

کے اٹھائے جانے سے متعلق قرآنی بیان (الاعراف :۱۷۱) سے مماثل ہندوؤں میں یہ عقیدہ بھی پایا جاتا ہے کہ ہنومان جی پہاڑ کو اٹھا لائے تھے۔ الغرض اسرائیلیوں اور ہندوؤں کے باہم مشترک عقائد اور رسم و رواج میرے اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ ہندوستان کے برہمن اسرائیلیوں ہی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں میرا خیال یہ بھی ہے کہ اپنشدز کی تحریروں میں صحفِ ابراہیم کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایک زمانے میں ان کا مطالعہ کیا تھا تو معلوم ہوا کہ ان کی تحریروں میں توحید کا عنصر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ قرآن حکیم میں صحفِ ابراہیمؑ اور صحفِ موسیٰؑ کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود ہے (الاعلیٰ :۱۹)۔ ''صحفِ موسیٰؑ'' تو عہد نامہ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابوں کی صورت میں آج بھی موجود ہیں' اگرچہ تحریف شدہ ہیں' لیکن صحف ابراہیمؑ کا بظاہر کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ دوسری طرف اپنشدز کی تحریروں میں توحید کی تعلیمات کا پایا جانا ان میں الہامی اثرات کی موجودگی کا واضح ثبوت ہے۔ اسی بنا پر میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ اپنشدز یا تو صحفِ ابراہیمؑ ہی کی تحریف شدہ شکلیں ہیں یا کم از کم صحف ابراہیمؑ کی تعلیمات کے اثرات کسی نہ کسی طرح ان تک ضرور پہنچے ہیں۔

❁❁❁


## ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

# ابوابِ خیر

## (حکمت اور بھلائی کے دروازے)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ۹/ مئی ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ　　بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

**قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝** (الحجرات)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ؓ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي سَفَرٍ فَأَصْبَحْتُ يَوْمًا قَرِيبًا مِنْهُ وَنَحْنُ نَسِيرُ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِي عَنِ النَّارِ ، قَالَ :

**((لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِيمٍ ، وَإِنَّهُ لَيَسِيرٌ عَلٰى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ : تَعْبُدُ اللّٰهَ لَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا ، وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ)) ثُمَّ قَالَ : ((أَلَا أَدُلُّكَ عَلٰى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ)) ثُمَّ تَلَا ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ حَتّٰى بَلَغَ ﴿يَعْمَلُوْنَ﴾ (السجدة:١٦'١٧) ثُمَّ قَالَ : ((أَلَا أُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ**



**وَعَمُوْدِهِ وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ؟)) قُلْتُ : بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ : ((رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ ، وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ)) ثُمَّ قَالَ : ((أَلَا أُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهِ؟)) فَقُلْتُ : بَلٰى : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ((فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ)) وَقَالَ : ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) قُلْتُ : يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ؟ فَقَالَ : ((ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ أَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ ، إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ))** (۱)

سیدنا معاذ بن جبل ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھا۔ ایک صبح ہم سب چل رہے تھے تو میں آپؐ کے قریب ہو گیا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم سے دور کر دے۔ آپؐ نے فرمایا:

''تو نے ایک انتہائی اہم چیز کا سوال کیا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ جس کے لیے آسان فرما دے اس کے لیے بلاشبہ یہ بڑا آسان کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ' نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرتے رہو' رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تجھے نیکی کے دروازے نہ بتاؤں؟ روزہ (جہنم سے) ڈھال ہے۔ صدقہ گناہوں کو یوں مٹا ڈالتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور انسان کا رات کے درمیان میں نماز ادا کرنا (بہت فضیلت کا باعث ہے)۔ اور پھر آپؐ نے سورۃ السجدۃ کی یہ آیات (۱۶'۱۷) تلاوت فرمائیں: ''اہل ایمان کے پہلو (رات کو) بستر سے علیحدہ رہتے ہیں اور وہ اپنے رب کو اس کے عذاب کے خوف اور رحمت کی امید کے ملے جلے جذبات و کیفیات سے پکارتے ہیں اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے۔ یہ سب ان کے کیے ہوئے اعمال کی جزا اور بدلہ ہو گا''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تجھے دین کی بنیاد' اس کا ستون اور اس کا بلند ترین عمل نہ بتا دوں؟'' میں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! کیوں نہیں!

(۱) سنن الترمذی' ابواب الایمان' باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ۔ قال ابو عیسیٰ ھذا حدیث حسن صحیح۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دین کی بنیاد 'اسلام' ہے' اس کا ستون 'نماز' ہے اور افضل و بلند ترین عمل 'جہاد' ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تجھے ان تمام اعمال کی بنیاد اور اصل کی خبر نہ دوں؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں' یارسول اللہ! کیوں نہیں! تو آپؐ نے اپنی زبان مبارک پکڑی اور فرمایا: ''اسے قابو میں رکھو''۔ (حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ) میں نے کہا: اے اللہ کے نبی ﷺ! ہم جو کچھ بولتے ہیں کیا اس پر بھی ہمارا مواخذہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''اے معاذ! تجھے تیری ماں گم پائے' لوگوں کو ان کے چہروں (یا نتھنوں) کے بل جہنم میں سب سے زیادہ ان کی زبانوں کی کٹائی (کمائی) ہی تو لے جائے گی۔''

معزز سامعین کرام!

آج ہمارے زیر مطالعہ اربعین نووی کی حدیث نمبر ۲۹ ہے' جس میں حکمت اور بھلائی کی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے ضمن میں' میں نے سورۃ الحجرات کی دو آیات تلاوت کی ہیں۔ یہ آیات اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں اسلام اور ایمان کے فرق کو واضح کیا گیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک الگ چیز ہے اور ایمان الگ۔ فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؀۱۴﴾

''بدو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے فرما دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' ہاں تم یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے' لیکن ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم اس حال میں بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال (کی جزا) میں سے کوئی کمی نہیں کرے گا۔ (اور یہ اس لیے ہے کہ) بے شک اللہ بہت بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

اس آیت میں اسلام اور ایمان کا فرق بیان کیا گیا ہے' جبکہ اگلی آیت میں مؤمن کی



تعریف بیان کی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ؀۱۵﴾

''(اللہ کے نزدیک) مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے (یعنی ان کی تصدیق قلب' یقین قلب کی شکل اختیار کر لے) اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

## تین درجات: اسلام' ایمان اور احسان

اسلام کی حقیقت اور اس کے مختلف مظاہر میں ایک درجہ بندی ہے' جس کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بڑی اہم ہے۔ جب شراب کی حرمت کا آخری حکم آیا تو بہت سے صحابہ کرام ؓ پریشان ہو گئے کہ ہمیں اسی وقت شراب چھوڑ دینی چاہیے تھی جب شراب کی حرمت کا اشارہ آ گیا تھا ——— شراب کے حوالے سے سب سے پہلا حکم یہ آیا تھا: ﴿يَسْـَٔــلُوْنَكَ عَنِ الْخَــمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْـمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ ان کا کیا حکم ہے؟) آپؐ کہہ دیجیے کہ ان دونوں کے اندر بہت بڑے گناہ کے پہلو ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں' البتہ ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے''۔ اس کے بعد دوسرا حکم یہ آ گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء:۴۳) ''اے اہل ایمان! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے کی حالت میں ہو' یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو جو کچھ تم کہہ رہے ہو'' ——— اس کے بعد سورۃ المائدۃ میں شراب کی حرمت کا آخری حکم آیا جس کا انداز بڑا تیکھا سا تھا۔ فرمایا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ؀۹۱﴾ (المائدۃ) ''پس اب بھی تم باز آتے ہو یا نہیں؟'' اس پر صحابہ کرام رضوان

اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض کو بہت تشویش ہوئی کہ ہم اتنا عرصہ شراب پیتے رہے‘ حالانکہ شراب کی حرمت کے اشارات آنے کے فوراً بعد ہی ہمیں شراب چھوڑ دینی چاہیے تھی۔ اس موقع پر یہ آیت اُتری جس میں فرمایا گیا: ﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا﴾ ”ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے‘ کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جو وہ (پہلے) کھا پی چکے“۔ یعنی جو لوگ اسلام اور ایمان پر کاربند ہو کر عمل کرتے رہے تو شراب کی حرمت کے آخری حکم کے آنے سے پہلے وہ جو کچھ کھاتے پیتے رہے‘ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾﴾ ”جب تک وہ تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں‘ پھر مزید تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں‘ پھر اور تقویٰ میں بڑھیں اور درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

اس آیت میں تین درجے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا درجہ ’اسلام‘ ہے‘ یعنی اللہ اور رسولؐ کو مان کر ان کے احکام پر عمل شروع کر دینا۔ اس سے اوپر کا درجہ ’ایمان‘ ہے‘ یعنی دِل کا کامل یقین‘ جو ایمان کے دل میں اُتر جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایمان حاصل ہو جانے کے بعد اعمال کی کیفیت بدل جائے گی اور اس میں ایک نئی شان اور جذبہ پیدا ہوگا۔ اس سے بھی آگے جب ایمان ”عین الیقین“ کا درجہ حاصل کر لے تو یہ درجہ ’احسان‘ ہے۔ اس کی تفصیل ہم حدیثِ جبریل میں پڑھ چکے ہیں —— رسول اللہ ﷺ نے احسان کی کیفیت ان الفاظ میں بیان فرمائی: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))(۱) ”یہ کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے‘ اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو پھر (یہ کیفیت تو پیدا ہونی چاہیے کہ) وہ تو تجھے دیکھتا ہے“ —— پھر ہم نے دین کی حقیقت کے بارے میں حضرت

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب سؤال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان...... وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔



معاذ بن جبل ؓ سے مروی ایک طویل حدیث میں بڑی تفصیل سے پڑھا تھا اور اسی کا تقریباً خلاصہ زیر مطالعہ حدیث میں آج ہم پڑھیں گے۔

وہ طویل حدیث میں نے حدیث جبریل کے ساتھ اسی لیے بیان کر دی تھی کہ یہ دونوں احادیث میرے نزدیک دین کی حقیقت اور اس کے اجزاء کے مابین نسبت و تناسب کو سمجھنے سمجھانے کے لیے نہایت اہم اور جامع ہیں۔ حضرت معاذؓ سے مروی وہ طویل حدیث سنن نسائی‘ سنن ابن ماجہ‘ سنن الترمذی‘ مسند احمد اور مسند بزار میں ہے اور امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ امام نوویؒ نے اس حدیث کو چھوڑ کر زیر مطالعہ مختصر روایت کو اپنی اربعین میں کیوں بیان کیا ہے۔ حالانکہ دونوں روایات حضرت معاذ بن جبل ؓ سے مروی ہیں‘ دونوں کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور ان دونوں کے بارے میں امام ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ احادیث حسن صحیح ہیں۔ مجھے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ امام نوویؒ چونکہ ایک مختصر کتاب مرتب کر رہے تھے لہٰذا انہوں نے اس میں طویل حدیث کے بجائے زیر مطالعہ مختصر حدیث کو شامل کیا ہے۔ واللہ اعلم!

## زیر مطالعہ حدیث کا واقعاتی پس منظر

زیر مطالعہ حدیث کا واقعاتی پس منظر اُس طویل حدیث میں مذکور ہے۔ اس وقت میں پوری حدیث کا متن تو نہیں پڑھ سکتا‘ البتہ اس کا مفہوم میں آپ کو بتا دیتا ہوں —— اس حدیث کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ یہ حدیث مجھے اس اعتبار سے بہت پیاری معلوم ہوتی ہے کہ اس میں دورِ نبویؐ کا ایک واقعہ ایسے بیان کیا گیا ہے جیسے ہم خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسے تصویر لفظی کہا جاتا ہے کہ لفظوں میں کسی چیز کا نقشہ کھینچ دینا‘ تصویر کھینچ دینا‘ اس طور سے کہ انسان اپنے آپ کو اس تصویر میں محسوس کرے —— روایت کا پس منظر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اپنے لشکر کو لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے تو آپؐ رات بھر سفر کرتے تھے‘ اس لیے کہ شدید گرمی کا موسم تھا اور اس موسم میں رات ہی کو سفر ممکن تھا۔ دن کے اوقات میں تو گرمی میں سخت تمازت ہوتی

تھی اور صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ صحرا نیچے سے آگ اُگل رہا ہوتا تھا اور سورج اوپر سے آگ برسا رہا ہوتا تھا‘ لہٰذا دن کے اوقات میں سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ رات بھر سفر کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فجر کے وقت پڑاؤ کیا اور فجر کی نماز باجماعت پڑھائی۔ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد سب لوگ جلد از جلد اپنی سواریوں پر سوار ہو گئے تاکہ سورج کے تیز ہو جانے تک مزید کچھ سفر کر لیں‘ کیونکہ جب دھوپ تیز اور تمازت شدید ہو جائے گی تو مجبوراً رکنا پڑے گا۔

اب یہ ہوا کہ ساری رات کے جاگے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی سواریوں پر اونگھنے لگے —— فجر کا وقت خاص طور پر ایسا ہوتا ہے کہ نسیم سحری انسان کو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ عام طور پر مشاہدہ یہ ہے کہ کوئی مریض کسی درد میں مبتلا ہو اور وہ ساری رات جاگتا رہے تو صبح کے وقت اسے کچھ نہ کچھ سکون حاصل ہو جاتا ہے اور وہ تھوڑی دیر سو لیتا ہے۔ چنانچہ تمام صحابہ کرامؓ اپنی سواریوں پر بیٹھے ہوئے اونگھنے لگے۔ ان کی اونٹنیوں کو آزادی مل گئی اور وہ چلتے چلتے اِدھر اُدھر جہاں کوئی کیکر کا درخت دیکھتیں تو اس پر منہ مار لیتیں۔ اس سے یہ ہوا کہ سارا لشکر وادی کی پوری چوڑائی میں پھیل گیا۔ لیکن حضرت معاذؓ جاگتے رہے اور اپنی اونٹنی کو حضور ﷺ کی اونٹنی کے ساتھ ساتھ چلاتے رہے۔ اچانک حضرت معاذؓ کی اونٹنی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر بدک گئی‘ اس کی وجہ سے اس کے قریب حضور ﷺ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے اپنے ہودج کا پردہ اٹھایا تو دیکھا کہ سوائے معاذ کے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ تمام صحابہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے آواز دی: ((یَا مُعَاذُ)) انہوں نے عرض کیا: لَبَّیْکَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ ”حضورؐ میں حاضر ہوں“۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اُدْنُ دُوْنَکَ)) ”نزدیک آ جاؤ‘ اور نزدیک آ جاؤ“۔ تو وہ قریب ہو گئے‘ یہاں تک کہ دونوں کی اونٹنیاں ایک دوسرے سے مس کرنے لگیں۔ تب حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا کُنْتُ اَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا کَمَکَانِھِمْ مِنَ الْبُعْدِ)) ”میرا گمان نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اتنے فاصلے پر ہوں گے“۔ ظاہر بات ہے کہ دشمن‘ خاص طور پر منافقین جو بظاہر اپنے ہیں‘ ہر وقت حضور ﷺ کی تاک میں تھے —— تبوک سے



واپسی کے دوران یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ کچھ منافقین ایک تنگ گھاٹی‘ جس میں بیک وقت ایک ہی اونٹ گزر سکتا تھا‘ میں چھپ کر بیٹھ گئے کہ حضور ﷺ کا اونٹ جب یہاں سے گزرے گا تو ہم حملہ کر کے حضور ﷺ کو قتل کر دیں گے‘ معاذ اللہ! اس وقت اس واقعہ کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو کیسے بچایا —— چنانچہ حضور ﷺ کو تعجب ہوا کہ لوگ مجھ سے اتنے فاصلے پر ہیں۔ گویا انہیں خیال ہی نہیں ہے کہ وہ میری حفاظت کے لیے میرے آس پاس رہیں۔

اس وقت اگر ہم میں سے کوئی ہوتا تو وہ اپنے نمبر بنانے کے لیے دوسروں پر تنقید کرتا کہ حضور! یہ لوگ تو پرواہ ہی نہیں کرتے‘ جبکہ مجھے دیکھئے کہ مجھے آپ کی کتنی پرواہ ہے اور میں تو آپ کی سواری کے ساتھ‘ اپنی سواری کو جوڑے چلا آ رہا ہوں۔ لیکن حضرت معاذؓ نے لوگوں کی طرف سے معذرت پیش کی کہ لوگ رات بھر کی بے خوابی کی وجہ سے اونگھ رہے تھے تو ان کی سواریاں انہیں لے کر اِدھر اُدھر متفرق ہو گئیں۔ اس جواب پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((وَاَنَا کُنْتُ نَاعِسًا)) ”ہاں میں بھی اونگھ رہا تھا“۔ دیکھئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو کوئی مافوق الفطرت انسان کے طور پر پیش نہیں کیا‘ بلکہ آپؐ نے اپنی بات بھی بتا دی کہ ٹھیک ہے یہ بشری تقاضے ہیں‘ جو میرے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں اور مجھے بھی اونگھ آ گئی تھی۔ اس سے آگے سوال و جواب کا ایک سلسلہ ہے‘ جہاں سے آج کی زیر مطالعہ حدیث شروع ہو رہی ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات کافی عرصے سے تھی کہ جب بھی حضور اکرم ﷺ کی خلوت میسر آئے گی تو میں آپؐ سے ایک خاص سوال کروں گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اس وقت حضور ﷺ کے ساتھ خلوت بھی میسر آ گئی ہے‘ اور حضور ﷺ خاص طور پر مجھ سے اس وقت خوش بھی ہیں کہ میرا یہ ساتھی جاگتا ہوا میرے ساتھ چلتا آ رہا ہے تو اس وقت انہوں نے سوال کیا۔

یہ سارا پس منظر میں نے اس طویل حدیث سے بیان کیا ہے جو اگرچہ اربعین نوویؒ میں شامل نہیں ہے‘ لیکن مجھے بہت پیاری ہے اور میں نے اس حدیث کو اس مجموعہ حدیث

کے آخر میں ’’حکمتِ دین کا عظیم خزانہ‘‘ کے عنوان سے درج کیا ہے۔ حدیثِ جبریل کے مطالعہ کے بعد اس حدیث کے مطالعہ میں ہم نے دو جمعے صرف کیے تھے۔

## زیر مطالعہ حدیث کا مطالعہ

اب ہم آج کی حدیث کا مطالعہ شروع کرتے ہیں — حضرت معاذ کہتے ہیں کہ جب مجھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خلوت نصیب ہوگئی تو میں نے کہا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِیْ عَنِ النَّارِ ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم کی آگ سے دور کر دے‘‘۔ قَالَ: ((لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِیْمٍ)) آپؐ نے فرمایا: ’’تم نے بہت بڑی بات پوچھی ہے‘‘۔ یہ گویا تحسین اور شاباش کا کلمہ ہے کہ تم نے وہی بات پوچھی ہے جو حقیقتاً پوچھنے کے قابل تھی۔ طویل حدیث میں بَخٍ بَخٍ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ عربوں کا ایک مخصوص کلمہ ہے جو وہ کسی کی تحسین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اردو میں ہم ’بہت خوب‘ بولتے ہیں تو گویا بہت کی ’ب‘ اور خوب کی ’خ‘ جمع ہو کر بَخٍ بن گیا۔ مزید یہ کہ طویل حدیث میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے تین دفعہ فرمایا کہ تم نے بڑی عظیم بات پوچھی ہے‘ بڑا عظیم سوال کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ یَّسَّرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ)) ’’(ویسے تو یہ بہت بڑی بات ہے) لیکن جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسان کر دے تو اس کے لیے بلاشبہ بہت آسان ہے۔‘‘

## اللہ کی عبادت کرنا اور شرک سے بچنا

حضرت معاذ کے سوال — مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم سے دور کر دے — کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے پہلا عمل یہ بتایا: ((تَعْبُدُ اللّٰہَ لَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا)) ’’اللہ کی بندگی اور پرستش کرو (اور) اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ‘‘۔ یہاں لفظ ’عبادت‘ اور ’شرک‘ آئے ہیں اور یہ دونوں ہی بہت جامع الفاظ ہیں۔ عام طور پر عبادت سے صرف نماز روزہ مراد لیا جاتا ہے‘ حالانکہ عبادت



کا مفہوم انہی تک محدود نہیں ہے‘ بلکہ عبادتِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ انتہائی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت‘ ہمہ جہت اور کامل اطاعت و فرماں برداری کرنا۔ (اس پر تفصیل سے گفتگو ہم کر چکے ہیں!) ہاں کبھی خطا ہو جائے تو توبہ کی جائے‘ اللہ سے استغفار کیا جائے‘ لیکن ایسا نہ ہو کہ مستقل طور پر کسی ایک گناہ کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا جائے۔ ہمارے معاشرے میں تو ایسا ہو رہا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ حج و عمرے بھی ہو رہے ہیں‘ نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہیں‘ نعتوں کی محافل کا بھی بڑے ذوق وشوق سے اہتمام ہو رہا ہے‘ لیکن ان سب کے ساتھ سودی کاروبار بھی جاری ہے اور سود کو چھوڑنے پر دل آمادہ ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سودی کاروبار قیامت کے دن ہر شے کی نفی کر دے گا۔

اسی طرح شرک بھی بہت جامع لفظ ہے اور اس سے مراد شرک فی الذات بھی ہے‘ شرک فی الصفات بھی اور شرک فی الحقوق بھی —— ہم تو سمجھتے ہیں کہ شرک صرف یہی ہے کہ بتوں کو سجدہ کیا جائے‘ یعنی اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے‘ جبکہ بعض زیادہ حساس قسم کے لوگ اللہ کی صفات میں کسی کو شریک کر دینے کو بھی شرک سمجھتے ہیں۔ لیکن اللہ کے حقوق میں کسی کو شریک کر دینا‘ جس کو ’’شرکِ عملی‘‘ کہا جاتا ہے‘ اس سے عام طور پر لوگ ناواقف ہیں۔ اس کے لیے میں آپ سب کو مشورہ دوں گا کہ شرک کے موضوع پر میری چھ تقاریر سنئے ☆۔ میری ان تقاریر کو علماء کے حلقوں میں بھی بہت پذیرائی ملی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ سے پہلی بات یہ فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے اس کی بندگی اور پرستش کرو۔ اس جملہ میں عبادت کے اثبات

☆ آج سے لگ بھگ تیس سال قبل بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم ومغفور نے شرک کے موضوع پر ایک ایک گھنٹے کی چھ تقریریں کی تھیں‘ جن کو بعد میں ’’حقیقت واقسامِ شرک‘‘ کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ شرک کی حقیقت اور شرک کی اقسام کے حوالے سے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ (مرتب)

کے ساتھ ہی شرک کی نفی بھی آ گئی‘ جیسے کلمہ طیبہ میں ہے: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ’’نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے۔‘‘

## ارکانِ اسلام اور ابوابِ خیر

اس نصیحت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو ’’ارکانِ اسلام‘‘ پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی اور فرمایا: ((وَتُقِیْمُ الصَّلَاۃَ ، وَتُؤْتِی الزَّکَاۃَ ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ ، وَتَحُجُّ الْبَیْتَ)) ’’اور تم نماز قائم کرو‘ زکوٰۃ ادا کرو‘ رمضان المبارک کے روزے رکھو اور اللہ تعالیٰ کے گھر کا حج کرو‘‘ —— سیدنا عبداللہ بن عمر ؓ سے مروی متفق علیہ حدیث میں ان کو ’ارکانِ اسلام‘ قرار دیا گیا ہے۔

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ، وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ، وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ، وَحَجِّ الْبَیْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ))(۱)

’’اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں‘ نماز قائم کرنا‘ زکوٰۃ ادا کرنا‘ بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔‘‘

ان ارکانِ اسلام کی بنیاد پر ہمارے معاشرے کا ایک خاص رنگ بنتا ہے اور انہی کے بل بوتے پر ہماری ایک خاص تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اصل میں اسلامی زندگی کا ایک خاص تمدن ہے جس کی تشکیل نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج سے ہوتی ہے۔

یہاں تک تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ کے جواب میں یہ دو باتیں فرمائیں‘ اس کے بعد اب حضور ﷺ نے خود حضرت معاذ سے پوچھا: ((اَلَا اَدُلُّکَ عَلٰی اَبْوَابِ الْخَیْرِ؟)) ’’کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ خیر کے دروازے کون کون سے ہیں؟‘‘ یعنی کیا میں تمہیں وہ اعمال نہ بتاؤں جن سے تمہیں خیر ہی خیر حاصل ہو! پہلی بات آپؐ نے یہ فرمائی: ((اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ)) ’’روزہ ڈھال ہے‘‘۔ یعنی روزہ نفس کے حملوں کے خلاف ایک ڈھال ہے۔ (ایک حدیث کے ضمن میں ہم اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔) دوسری بات آپؐ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان ارکان الاسلام۔



نے یہ فرمائی: ((وَالصَّدَقَۃُ تُطْفِئُ الْخَطِیْئَۃَ کَمَا یُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ)) ’’اور صدقہ گناہوں کو ایسے مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے‘‘۔ یعنی اگر کوئی خطا ہو گئی‘ کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو اللہ کی راہ میں صدقہ دو تو یہ صدقہ اس گناہ کے اثرات کو اس طرح دھو دے گا جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ صدقہ کے حقیقی مفہوم اور اس کی وسعت کے بارے میں تفصیلی گفتگو حدیث ۲۵ اور ۲۶ کے ضمن میں ہو چکی ہے۔

## تہجد: رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ

تیسری بات آپ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَصَلَاۃُ الرَّجُلِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ)) ’’بندے کا رات کے درمیانی حصے میں نماز پڑھنا (بہت فضیلت کا باعث ہے)‘‘۔ رات کے درمیان میں پڑھی جانے والی نماز کو عرفِ عام میں ’’تہجد‘‘ کہا جاتا ہے۔ عام طور پر بعض لوگ اذانِ فجر سے کچھ دیر پہلے جاگ کر جلدی سے آٹھ نفل پڑھ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے تہجد پڑھ لی۔ درحقیقت یہ تہجد نہیں‘ عام نوافل ہیں جنہیں فجر کا ضمیمہ بنا لیا گیا ہے۔ بہرحال یہ بھی فضیلت و برکت والا عمل ہے اور اس پر بھی اللہ تعالیٰ اجر و ثواب سے نوازے گا۔ لیکن اصل میں تہجد اسے کہا جاتا ہے کہ رات کو سو کر‘ نیند کو توڑ کر اٹھنا‘ نوافل ادا کرنا‘ پھر سو جانا اور پھر فجر کے لیے دوبارہ اٹھنا۔ یعنی جب نصف رات گزر جائے تو اس وقت انسان بیدار ہو کر ثلث رات تک نوافل پڑھے اور پھر سو جائے اور پھر طلوعِ صادق کے وقت فجر کے لیے اٹھے۔ حضور اکرم ﷺ کے الفاظ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں‘ اس لیے کہ جَوْف کہتے ہیں پیٹ کو اور جَوْفِ اللَّیْل کا معنی ہے رات کا درمیانی حصہ!

اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے اس قول —— ((وَصَلَاۃُ الرَّجُلِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ)) —— کے لیے سورۃ السجدۃ کی آیات ۱۶ تا ۱۷ تلاوت فرمائیں‘ جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ز وَّمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾

’’(راتوں کو) ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے رب کو

پکارتے رہتے ہیں خوف اور امید کی کیفیت میں‘ اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (ہماری رضاجوئی کے لیے) خرچ کرتے ہیں۔‘‘

انہیں اللہ کے مواخذے‘ اس کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا خوف ہوتا ہے‘ جبکہ انہیں اللہ کی طرف سے اجر وثواب کی طمع ہوتی ہے۔ سب سے بڑی طمع انہیں یہ ہوتی ہے کہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے‘ اس لیے کہ سب سے اونچا مقام یہی ہے: ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ ؕ﴾(البینۃ:۸) ’’اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے‘‘۔ یہ اللہ اور بندے کی باہمی رضا ہے۔ بندہ اپنے رب سے راضی رہے بایں طور کہ دنیا میں جو بھی مصائب اور تکالیف آئیں ان پر کوئی شکوہ زبان پر نہ لائے۔ بس یہی سوچے کہ یہ میرے رب کی طرف سے ہے جو میرا آقا‘ میرا دوست اور میرا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس چیز کے پیچھے کیا خیر ہے اور کیا شر‘ اور کون سی چیز میرے لیے بہتر ہے اور کون سی بری۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾﴾

’’اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے۔‘‘

اگر ہم اس کیفیت کے اندر دنیوی زندگی گزاریں تو اللہ ہم سے راضی ہو جائے گا اور پھر آخرت میں ہمیں بھی راضی کر دے گا۔ یہ باہمی رضا کا معاملہ ہے اور یہ درحقیقت تہجد سے حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کے لیے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے‘ اس کا اندازہ لگانا انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی انسانی سوچ وہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ اس ضمن میں فرمایا:

﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾

’’تو کوئی انسان نہیں جانتا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے‘ اُن کے اعمال کے بدلے کے طور پر۔‘‘



قرآن مجید میں جنت کی جتنی بھی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کا تعلق اہلِ جنت کی ابتدائی مہمانی سے ہے‘ اور اس کے لیے الفاظ بھی وہ استعمال کیے گئے ہیں جو ہماری ذہنی سطح کے قریب ہیں‘ مثلاً وہاں پر پھل ہوں گے‘ شہد اور دودھ کی نہریں ہوں گی‘ ایسی خالص شراب ہو گی جس میں نہ کوئی نشہ ہو گا اور نہ ہی کوئی بہکنے کی بات ہو گی‘ جوان اور ہم عمر حوریں ہوں گی‘ وغیرہ۔ یہ ساری نعمتیں تو ابتدائی جنت کی ہیں‘ لیکن اللہ کے خاص بندوں کو رفتہ رفتہ جنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات میں لے جایا جائے گا اور وہاں کی نعمتوں کا نہ تو کسی کو علم ہے اور نہ ہی ان کا تصور انسانی فہم وادراک میں آ سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان نعمتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ: اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ)) (۱)

’’اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرا۔‘‘

## دین کی بنیاد اور اس کا ستون

اس کے بعد یوں سمجھیے کہ حضور ﷺ کا دریائے سخاوت مزید جوش میں آیا اور آپ ﷺ نے حضرت معاذ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: ((اَلَا اُخْبِرُکَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِہٖ وَذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ؟)) ’’(اے معاذ!) کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ دین کی جڑ (بنیاد) کیا ہے اور اس کا عمود (ستون) کیا ہے اور اس کا بلند ترین عمل کون سا ہے؟‘‘ ـــــ عام طور پر اکثر لوگوں کو دین کے مختلف اعمال کے بارے میں تو معلوم ہوتا ہے‘ لیکن دین کے مختلف اعمال کے مابین باہمی نسبت کیا ہے‘ کیا چیز مقدم ہے اور کیا ثانوی حیثیت رکھتی ہے‘ کس چیز کا کس کے ساتھ منطقی ربط ہے‘ یہ درحقیقت حکمتِ دین کا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق‘ باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ وانہا مخلوقۃ ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واہلہا۔ یہ حدیث بخاری ومسلم اور صحاح ستہ کی دیگر کتب کے متعدد ابواب میں بیان ہوئی ہے۔

خاص موضوع ہے اور اس کے بارے میں سب کو علم نہیں ہے — زیر مطالعہ روایت میں رسول اللہ ﷺ نے پورے دین کو ایک درخت سے تشبیہہ دی ہے۔ ایک ہے اس کی جڑ اور بنیاد' ایک ہے اس کا تنا اور پھر درخت کی سب سے قیمتی چیز اس کی چوٹی ہے جہاں پھل لگتا ہے۔ جیسے آم کے درخت کی جڑیں بھی ہیں اور اس کا تنا بھی ہے' پھر اس تنے کے اوپر شاخیں پھیلتی ہیں جن میں پتے اور اصل شے آم لگتے ہیں۔ اسی طرح گلاب کے پودے کی جڑ میں پھول نہیں لگتے اور نہ ہی اس کے تنے میں لگتے ہیں' بلکہ پھول تو اس کے اوپر چوٹی پر لگتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کی جڑ' اس کے عمود اور اس کی چوٹی کے بارے میں بتاؤں؟ حضرت معاذ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں' ضرور فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ)) ''دین کی جڑ اور بنیاد اسلام ہے''۔ ایک تو ہے اسلام اپنے ارکان کے حوالے سے' لیکن یہاں اسلام سے مراد ارکانِ اسلام نہیں ہیں' بلکہ یہاں اسلام اس معنی میں آیا ہے کہ پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت! اسلام کے لغوی معنی ہیں: سرنڈر کر دینا' ہتھیار پھینک دینا۔ اس لفظ کے اندر اصل میں نقشہ یہ ہے کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں تو ان میں سے ایک نے اپنے ہتھیار پھینک دیے۔ گویا اُس نے سرنڈر کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنڈر کرنے کا نام اسلام ہے اور یہ درحقیقت دین کی جڑ اور بنیاد ہے۔

دین کے ستون کے حوالے سے آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَعَمُوْدُہُ الصَّلَاۃُ)) ''اس کا تنا نماز ہے''۔ نماز کے بارے میں یہ بھی آیا ہے: ((اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ)) ''نماز دین کا ستون ہے''۔ عِماد اور عَمود کا مادہ ایک ہی (عمد) ہے۔ اگر دین کو عمارت سے تشبیہہ دیں تو اس کے معنی ستون کے ہوں گے اور اگر درخت سے تشبیہہ دیں تو اس کے معنی تنا کے ہوں گے۔

## دین کا افضل ترین عمل: جہاد فی سبیل اللہ

رسول اللہ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کو دین کی چوٹی اور افضل ترین عمل قرار دیتے



ہوئے فرمایا: ((وَذِرْوَۃُ سَنَامِہِ الْجِھَادُ)) ''اور اس کی چوٹی اور افضل ترین عمل جہاد ہے''۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے ذہنوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے۔ ہمارا سارا ذہن اور ہماری ساری جدوجہد ''ارکانِ اسلام'' کے اوپر ہے۔ بہت دیندار قسم کے لوگ بھی ارکانِ اسلام پر تو عمل پیرا ہو جائیں گے' لیکن اس سے آگے نہیں جائیں گے۔ اسی لیے ابتدا میں' میں نے سورۃ الحجرات کی آیت آپ کو سنائی تھی جس میں فرمایا گیا کہ صرف وہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں جن میں یہ تین شرائط پائی جاتی ہوں: (۱) اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لانا' (۲) پھر شک میں نہ پڑنا' یعنی تصدیق قلب کا یقین قلب کی شکل اختیار کر لینا' اور (۳) اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ اگر یہ جہاد نہیں ہے' تو آپ سمجھ لیجیے کہ دین کے درخت کو پھل نہیں لگا۔ اس لیے کہ اس درخت کا پھل تو جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس صورتِ حال میں ہمارے ایمان کی کیفیت صرف ایک زبانی عقیدہ کی ہے جو ہم نے اپنے والدین سے سن رکھا ہے۔

جب اسلام کو اللہ نے فتح دی تو اس وقت لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے اور اس وقت یہ داخل ہونا درحقیقت اس بنیاد پر تھا کہ اب ہم مقابلہ نہیں کر سکتے لہٰذا ہم سرنڈر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا کہ تمہارا ایمان لانے کا دعویٰ مبنی بر حقیقت نہیں ہے' اس لیے کہ ابھی تمہارا ایمان یقین کی کیفیت میں نہیں پہنچا۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے سرنڈر کر دیا ہے' سرِتسلیم خم کر دیا ہے اور اب ہماری مزاحمت اور مخالفت ختم ہو گئی ہے۔ یہ بھی اس وقت ہے کہ اگر تم نے یہ سرِتسلیم خلوصِ دل کے ساتھ خم کیا ہے اور اس میں کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اور اگر معاملہ یہ ہے کہ تم نے ابھی اس نیت سے سر جھکا دیے ہیں کہ حالات بدلیں گے تو پھر کھڑے ہو جائیں گے تو یہ سراسر منافقت ہے۔ لیکن اگر اس قسم کی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے اور آپ ایمان لائے ہیں' آپ نے گواہی دی ہے: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ تو اب آپ مسلمان مان لیے گئے ہیں اور اب آپ کی جان اور مال محفوظ ہیں۔ لیکن اگر جہاد نہیں ہے تو پھر آپ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹے ہیں۔ جہاد کے بارے میں

تو رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِغَزْوٍ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ نِفَاقٍ))(۱)

’’جو کوئی اس حالت میں مرے کہ نہ تو اس نے کبھی جہاد کیا ہو اور نہ ہی کبھی اس نے جہاد کی نیت کی ہو تو وہ شخص نفاق کے ایک حصہ پر مرا۔‘‘

## دین کی چوٹی: جہاد اور جہاد کی چوٹی: قتال

جہاد کے معنی لوگوں نے صرف جنگ کے سمجھے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے‘ اس لیے کہ جنگ کے لیے تو قرآن کی اصطلاح قتال فی سبیل اللہ ہے۔ سورۃ الصّف میں یہ دونوں الفاظ آئے ہیں۔ آیت ۱۰‘۱۱ میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۱۰) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱)﴾

’’اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے رستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔‘‘

اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جہاد کے بغیر جہنم سے چھٹکارا پانے کا خیال ایک امیدِ موہوم اور بے بنیاد تمنا ہے۔ ان آیات میں تو جہاد کا تذکرہ ہے‘ جبکہ آیت ۴ میں قتال کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۴)﴾

’’اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں‘ جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔‘‘

لہٰذا ثابت ہوا کہ قتال فی سبیل اللہ الگ شے ہے اور جہاد فی سبیل اللہ الگ۔ حضور اکرم ﷺ کے بارہ سالہ مکی دور میں قرآن کے ذریعے سے جہاد فی سبیل اللہ ہو رہا

(۱) سنن النسائی‘ کتاب الجهاد‘ باب التشدید فی ترک الجهاد۔



تھا‘ دعوت و تبلیغ‘ تربیت و تزکیہ اور تنظیم جیسے ذرائع سے جہاد ہو رہا تھا‘ جبکہ مدینہ میں پہنچ کر یہ جہاد قتال کی شکل اختیار کر گیا۔

اس اعتبار سے نوٹ کر لیجیے کہ جہاد صرف جنگ کا نام نہیں ہے۔ اللہ کے دین کو اپنے اوپر نافذ کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ دوسرا بڑا جہاد ہے اللہ کے دین کی دعوت و تبلیغ اور اس مقصد کے لیے جان و مال کھپانا اور وقت لگانا۔ تیسرا بڑا جہاد ہے: اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کرنا۔ آپ سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے گھر والوں پر اللہ کے دین کو نافذ کریں اور پھر اللہ کا دین لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ بھی آپ کی پکار پر خلوصِ دل کے ساتھ لبیک کہیں‘ انہیں منظم کریں اور ان کو سمع و طاعت کا خوگر بنائیں اور جب معتد بہ تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں تو پھر جہاد کا بلند ترین درجہ آئے گا‘ اور وہ ہے اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کے لیے قتال کرنا۔

صاف ظاہر ہے کہ جب تک مناسب تعداد میں لوگ موجود نہ ہوں اور ان کی پوری طرح ٹریننگ بھی نہ ہوئی ہو تو اُس وقت تک جنگ نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ جہاد تو کر رہے ہوں‘ لیکن انہیں مخلص لوگوں کی اتنی تعداد میسر ہی نہ ہو کہ وہ قتال کر سکیں تو صرف جہاد ہی ان کی نجات کے لیے کافی ہو جائے گا۔ البتہ اگر اللہ کی توفیق سے اس معاشرے سے response مل جائے اور معتد بہ تعداد میں لوگ منظم بھی ہو جائیں اور انہوں نے اپنے اوپر اللہ کے دین کو نافذ بھی کر لیا ہو —— یہ نہیں کہ اپنے اوپر‘ اپنے گھر میں تو دین ہے نہیں اور باہر دین نافذ کرتے پھریں —— پھر انہوں نے کسی ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت اور بیعت جہاد بھی کر لی ہو اور ان کے دلوں سے سوائے اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے ہر امنگ نکل گئی ہو تو اس وقت نظامِ باطل کے ساتھ جا ٹکرانے اور قتال کا مرحلہ آئے گا۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ نیت بالکل خالص ہونی چاہیے —— اس مجموعہ کی پہلی حدیث میں ہم نے پڑھا تھا:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى ‘ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ

اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ)) (متفقٌ علیہ)

''بے شک اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔ پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہوئی' تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کے حساب میں شمار ہوگی۔ اور جس کی ہجرت ہوئی دنیا کے حصول کے لیے تاکہ دنیا حاصل کرے یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے شمار ہوگی جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔''

اگر یہ قتال مالِ غنیمت یا حکومت حاصل کرنے کے لیے ہے یا کسی قبیلے سے کوئی دشمنی چلی آ رہی ہے اور اب اس سے بدلہ لینے کی نیت سے جہاد میں شریک ہو رہے ہیں تو یہ قتال فی سبیل اللہ نہیں' قتال فی سبیل النفس ہے۔

## زبان کا کنٹرول: جنت کے حصول کی ضمانت

حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَا اُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ؟)) ''اے معاذ! میں تمہیں ان تمام معاملات کی روح کے بارے میں بتاؤں؟'' یعنی کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو ان تمام اجزاء کو جوڑنے والی ہے اور ان کو صحیح رخ پر اور صحیح روح کے ساتھ آگے بڑھانے والی ہے! —— مَلَاك کہتے ہیں روح اور مغز کو۔ عرب کہتے ہیں: اَلْقَلْبُ مَلَاكُ الْجَسَدِ ''دل پورے جسم کے لیے ملاک ہے'' یعنی دل پورے جسم کا روحِ رواں ہے۔ دل ہے تو زندگی ہے اور اگر دل بند ہو جائے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس تمام معاملے کی روح کے بارے میں نہ بتاؤں؟ حضرت معاذ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ضرور فرمائیے۔ فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ ''پس حضور ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا'' اور فرمایا: ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) ''اس کو روک کر رکھو''۔ یعنی زبان سے کوئی غلط اور ظالمانہ کلمہ نہ نکلے' کوئی غیبت اور کوئی تہمت برآمد نہ ہو' خواہ مخواہ کسی کی عزت کے اوپر حملہ نہ ہو۔ زبان



کو اپنے قابو میں رکھو اور جب بھی زبان کھولو تو حق اور سچ کی بات کرو۔ یہ بات قرآن مجید میں بھی آئی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝۷۰﴾ (الاحزاب) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور بات کیا کرو سیدھی سچی''۔ اگر یہ دو کام ہو جائیں یعنی دل میں تقویٰ ہو اور زبان پر مکمل کنٹرول ہو تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ: ﴿یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ﴾ ''اللہ تمہارے سارے اعمال درست کر دے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا''۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((مَنْ يَتَكَفَّلْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَتَكَفَّلْ لَهُ بِالْجَنَّةِ))[(۱)]

''جو شخص مجھے اپنی زبان اور شرمگاہ کی ضمانت دے دے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

زیرِ مطالعہ حدیث میں بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اس پر حضرت معاذؓ کی سادگی دیکھئے —— حضرت معاذ وہ ہیں جن کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ))[(۲)] کہ میرے صحابہ میں حلال و حرام کا سب سے زیادہ جاننے والا معاذ بن جبل ہے! یعنی ہم یوں کہیں گے کہ فقہ کے سب سے بڑے ماہر معاذ بن جبل ہیں —— وہ اس بات پر حیران ہو کر کہتے ہیں: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ؟ ''اے اللہ کے نبی ﷺ! کیا ہمارا اس پر بھی مواخذہ ہوگا جو ہم کلام کرتے رہتے ہیں''۔ ظاہر بات ہے آدمی جب دوستوں کے اندر بیٹھا گپ شپ کرتا ہے تو اُس وقت زبان پر کنٹرول نہیں رہتا۔ اس وقت تو جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ اب اس میں غیبتیں بھی ہو رہی ہیں' غلط باتیں بھی ہو رہی ہیں' جھوٹ بھی بولا جا رہا ہے...... تو حضرت معاذؓ نے پوچھا: اے اللہ کے نبی ﷺ! یہ جو ہم باتیں کرتے رہتے ہیں کیا اس پر بھی ہمارا مواخذہ ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں حضور ﷺ کی محبت اور شفقت ملاحظہ ہو۔ آپؐ نے

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ما جاء فی حفظ اللسان۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب معاذ بن جبل ۔و سنن ابن ماجہ' المقدمة' باب فضائل خباب۔

فرمایا: ((ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ یَا مُعَاذُ!))’’اے معاذ! تمہیں تمہاری ماں گم کرے‘‘۔ یعنی تمہاری گمشدگی پر یا تمہاری غیر حاضری پر تمہاری ماں روئے —— عربوں کے ہاں یہ جملہ لاڈ پیار سے بھی بولا جاتا تھا —— ((وَھَلْ یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ اَوْ قَالَ عَلٰی مَنَاخِرِھِمْ، اِلاَّ حَصَائِدُ اَلْسِنَتِھِمْ))’’لوگوں کو ان کے چہروں کے بل جہنم میں جھونکنے والی سب سے بڑی شے زبان کی کٹائی (کمائی) ہی تو ہوگی‘‘۔ حَصِیْد کہتے ہیں اس فصل کو جو مکمل طور پر کٹ گئی ہو‘ جیسے گندم کا پودا پورے کا پورا کاٹا جاتا ہے۔ گویا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِھِمْ کا مفہوم یہ ہے کہ زبان سے جو بھی لفظ نکلتا ہے وہ آخرت کے اندر ایک بیج بن کر وہاں پروان چڑھتا ہے۔ لہٰذا جو فصلیں زبانوں سے بوئی جا رہی ہیں‘ کل قیامت کے دن جب یہ کٹیں گی تو یہی سب سے بڑھ کر انسانوں کو جہنم میں جھونکنے کا باعث بنیں گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس حدیث میں بیان کردہ حکمت اور بھلائی کی باتوں پر صحیح جذبے اور خلوصِ نیت کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمُسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات)

# تزکیۂ نفس

جناب احمد جاوید

گزشتہ دنوں علامہ احمد جاوید صاحب کراچی تشریف لائے ہوئے تھے۔اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت موصوف کو قرآن اکیڈمی یٰسین آباد کراچی کے مرکز تعلّم و تحقیق میں ''تزکیۂ نفس'' کے عنوان پر خطاب کی دعوت دی گئی جو آں جناب نے انتہائی شفقت کے ساتھ قبول فرمائی۔ اکیڈمی میں کیے گئے اس پُر اثر و پُر مغز خطاب اور سوال و جواب کو قرآن فہمی کورس سال دوم کے طالب علم جناب عبدالرحمٰن صالح نے مضمون کی صورت میں مرتّب کرنے کی سعادت حاصل کی۔ افادۂ عام کے لیے اس اہم موضوع پر محترم احمد جاوید صاحب کی گفتگو ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

ارسال کردہ: مرکز تعلّم و تحقیق، قرآن اکیڈمی یٰسین آباد، کراچی

**احمدہ واصلی علی رسولہ الکریم...... اما بعد:**

آج جس موضوع پر مجھے کچھ معروضات پیش کرنی ہیں اس کی دینی ضرورت اور اس کی دینی اسناد تو بہت معروف شکل میں واضح ہیں۔ میں کوشش کروں گا اس بات کو واضح کروں کہ تزکیۂ نفس، انسانی شخصیت کی مقصدی تشکیل اور تکمیل میں بنیادی اہمیت کیسے رکھتا ہے؟ مجھے امید ہے اس کے نتیجے میں ہم اس ضرورت کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے ایک فطری آمادگی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ جو بہت بڑی اور بنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں اور جن کی تکمیل پر گویا ہمارے ''ہونے نہ ہونے'' کا دارومدار ہوتا ہے، ان کا شعور رکھنے اور ان کو اہمیت دینے کے معاملے میں ان پر ذہن کا بہترین استعداد کے ساتھ قائل ہونا اور ان کی طرف طبیعت کا اپنی بنیادی قوت کے ساتھ راغب ہونا نہایت مفید اور بہت ضروری ہوتا ہے۔



## موضوع کی اہمیت

دینی فکر کی بعض جدید روایتوں میں ایک چلن پیدا ہوا کہ تزکیۂ نفس کو اسلام کا ''مقصودِ اعظم'' قرار دیا جائے، لیکن اس حد تک بڑھنا شاید مناسب نہ ہو، یعنی یہ کہنا کہ تزکیۂ نفس ہمارے دین کا ''مقصودِ اعظم'' ہے، اس کو ذرا mild کر کے اور نسبتاً قابلِ قبول بنا کر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا دین ہمارے سامنے جو مقاصد مستقل انداز سے متعیّن کر کے رکھتا ہے، ان کی طرف ذہناً اور طبعاً یکسو ہوئے بغیر دین کے ساتھ تعلق کی کسی زیادہ قابلِ اعتماد بنیاد پر نہیں رہا جا سکتا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جو چیز واحد ذریعے کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے ''تزکیۂ نفس''۔ نفس کا تزکیہ کیے بغیر اور تزکیے کے عمل کو آخری سانس تک نبھائے بغیر دین کے نظامِ مقاصد سے ہم آہنگ نہیں رہا جا سکتا، یعنی ہم اپنے دین کے ساتھ اس کی مطلوبہ وابستگی کو پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔

## نفس

ہمیں پہلے قدم پر یہ سمجھنا ہے کہ ''نفس'' کیا ہے۔ یعنی جس نفس کا تزکیہ ہم اپنا مطلوب و مقصود سمجھتے ہیں، وہ ''نفس'' کیا ہے؟...... اور میرے خیال میں یہ بات یاد رکھنے اور ہمیشہ ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ نفس کی گہری معرفت کے بغیر تزکیہ کا عمل ناقص رہتا ہے۔

''تزکیہ'' کے لیے نفس کی گہری پہچان میسر ہونا ضروری ہے۔ اگر نفس کی پہچان میں کوئی سطحیت ہوئی تو تزکیہ کے عمل میں بھی وہی سطحی پن پیدا ہو جائے گا اور تزکیہ زیادہ گہرائی تک مؤثر نہیں رہے گا۔ نفس کو سمجھنے کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''نفس گویا کل وجودِ انسانی ہے'' اور اس کے تین بنیادی اجزاء ہیں۔ یعنی نفس تین دائروں سے بننے والی ''اقلیم'' کا نام ہے۔ اس کا پہلا دائرہ یا مرحلہ ''طبیعت'' ہے۔ دوسرا دائرہ ''ارادہ'' ہے۔ تیسرا دائرہ ''ذہن'' ہے۔ طبیعت، ارادے اور ذہن کے مجموعے کو ''نفس'' کہتے ہیں۔ یعنی نفس کی ترکیب میں طبیعت، ارادہ اور ذہن شامل ہیں اور تزکیہ ان تینوں درجات میں مطلوب ہے۔ نفس کی یہ تعریف ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہیے، تاکہ ہم نفس میں سدھار کا کوئی کلی، مجموعی اور زیادہ مؤثر طریقہ اختیار کر سکیں۔

اب ہم نفس کے اجزاء کی طرف آتے ہیں جو علی الترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ''طبیعت'' رغبت و بے رغبتی کا ماخذ ہے۔

(۲) ''ارادہ'' صحیح اور غلط کی طرف پیش قدمی کرنے کی قوت ہے۔

(۳) ''ذہن'' حق اور باطل میں تمیز کرنے کا آلہ ہے۔

اس بات کو اگر زیادہ اصولی انداز سے کہا جائے تو یوں ہوگی: چاہے دین ہو یا دنیا' اصل میں ہمارے چار ہی معیار ہیں۔ ہمارے شعور اور ہماری زندگی کے لیے چار ہی راستے ہیں جن پر ہم چلتے رہتے ہیں۔ یعنی ہم ہر چیز کو چار کھڑکیوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

پہلا تناظر: یہ چیز حق ہے یا باطل ہے۔ دوسرا تناظر: یہ چیز صحیح ہے یا غلط ہے۔ تیسرا تناظر: یہ چیز مفید ہے یا مضر ہے۔ چوتھا تناظر: یہ چیز مرغوب ہے یا مکروہ ہے' یعنی چیز رغبت کا موضوع ہے یا کراہت کی پیدائش کا سبب ہے۔ یہ چار تناظر (perspectives) ہر انسان میں خلقتاً رکھے گئے ہیں' اور ہمارا دین ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ان چاروں perspectives کو ان کی اصولی ترتیب اور ترجیح کے ساتھ عمل میں رکھیں۔ یعنی اب دینی نقطۂ نظر سے تزکیۂ نفس یہ ہوا کہ ہم ہر چیز پر پہلا perspective اور پہلا معیار جو apply کریں وہ یہ ہونا چاہیے کہ ''یہ چیز حق ہے یا باطل؟'' اگر وہ حق ہونا qualify کر لیتی ہے تو اب ہمیں دوسرے perspective کی رو سے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس حق کی جو تعبیر ہم قبول کر رہے ہیں وہ ''صحیح ہے یا غلط؟'' تو حق قبول کر کے اس کی صحت محفوظ کرنا اور اس کی تعبیری صحت دریافت کر کے محفوظ کرنا' یعنی حق کی صحیح پہچان اور اس کی صحیح تر تعبیر' یہ گویا پہلے دو معیار ہیں۔

اسی طرح تیسرا perspective یہ ہونا چاہیے کہ جب حق کی قبولیت' معیارِ صحت کو qualify کر جائے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا ہم اس چیز کی افادیت کو کیسے generate کر سکتے ہیں؟ ہم حق کو اس کی صحت کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید کیسے بنا سکتے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں ہم حق کو اصلِ افادیت کیسے بنا سکتے ہیں۔ چوتھا perspective یہ ہونا چاہیے کہ ہم حق کی طرف اپنی طبیعت کو اس کی پوری استعدادی رغبت کے ساتھ یکسو کیسے رکھ سکتے ہیں؟ مختصر یہ کہ ''نفسِ مزکّی'' اس شخصیت کا نام ہے جس کا مدار و محور' جس کا مطلوب و مقصود حق ہو اور حق ہی اس کے لیے مادۂ صحت ہو' حق ہی اس کے لیے اصلِ افادیت ہو اور حق ہی اس کو مرغوب و محبوب ہو۔ نفس جب ان چار مراحل کو ان کی شرائط کے ساتھ پورا کر لے تو وہ نفس ''نفسِ مزکّی'' کا مصداق ہے۔

## موجودہ دین داری اور سلف کی دین داری کا موازنہ

ہمارے موجودہ اسلوبِ دین داری کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں دین ان چاروں



معیارات سے چھن کر ہماری متاعِ عزیز نہیں بنا' یعنی دین کی حقانیت ذہن کی بہترین قوت کے ساتھ ثابت ہونی چاہیے۔ دین کی صحت' استدلال کے بہترین مادے کا نتیجہ ہونی چاہیے اور دین کی افادیت' ارادے کے productive ہونے سے ثابت ہوتی رہنی چاہیے اور دین کی محبوبیت طبیعت کے مسلسل اور مستقل میلان سے چھلکنی چاہیے۔

ہم نے اپنے دین کو اپنی شخصیت کے بعض اجزاء سے متعلق کر رکھا ہے اور اپنی شخصیت کے کچھ ضروری حصوں کو اپنے دین سے لاتعلق کیا ہوا ہے' اور خود کو مجموعی طور پر دین کی تحویل میں نہ دے سکنا' یہ ہمارا اجتماعی نقص ہے' جب کہ ہمارے اسلاف کے لیے کوئی بھی علم' کوئی بھی عمل' کوئی بھی رغبت و کراہت' کوئی بھی منفعت و مضرت' یہ ساری کی ساری ایک دینی رنگ میں تھیں۔ وہ چیزوں کے ساتھ تعلق کا کوئی ایسا زاویہ اختیار نہ کرتے تھے جو زاویہ ان کو دین سے فراہم نہ ہوا ہو۔ ان کے نظامِ تعلق کی ساری بنیاد ''تعلق مع الحق'' پر استوار تھی۔ ان کے نظمِ عداوت کا سارا مادہ ''البغض فی اللہ'' کے مادّے سے پھوٹا تھا۔ یعنی انہوں نے اپنے نفس کو اپنی تمام تر جامعیت اور کلیت کے ساتھ اپنے دین کی تحویل میں دے رکھا تھا۔

## تزکیہ کسے کہتے ہیں؟

تزکیہ کہتے ہیں کسی چیز کو حالتِ خیر پر محفوظ رکھنے اور اس کی نشوونما کا سامان کرنے کو۔ کوئی ایسی چیز جو خیر اور شر دونوں کا مجموعہ ہو' اس چیز میں سے شر کے ازالے کا سامان کرنا اور خیر کو نشوونما دینے کی صورت نکالنے کے عمل کو تزکیہ کہتے ہیں۔ خیر اور شر دونوں محض اخلاقی نہیں ہیں۔ دورِ جدید کی ایک بہت بڑی شیطنت یہ ہے کہ اس نے دینی مقاصد کو عام اخلاقی مقاصد اور داعیات سے بدل دیا ہے۔ یعنی دورِ جدید کا فلسفۂ اخلاق دین پر ایک بہت بڑی ضرب ہے۔ ہمارا تصورِ نفس اور ہمارا تصورِ تزکیہ یہ ہے کہ حسن و قبح' خیر و شر یہ تمام اصول شریعت سے طے ہوتے ہیں' نہ کہ عقل سے۔ اللہ نے خیر اور شر کے جس مادّے کے امتزاج سے نفس کو خلق فرمایا ہے اس مادّے کے امتزاج میں خیر کو شر پر مستقلاً غالب رکھنا' اللہ کے بنائے ہوئے خیر کی روشنی میں ''عملِ تزکیہ'' ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ فیضانِ تربیت تھا کہ صحابہ کے لیے ''تزکیۂ نفس'' بندگی کی تکمیل کا نام تھا۔ تکمیلِ بندگی سے مراد ہے اللہ کی اطاعت اور اس کی پرستش میں صادق ہونا۔ ان دونوں کا مجموعہ دراصل وہ بندگی ہے' جس کے لیے اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے' جو

ازروئے قرآن ہمارا مقصدِ تخلیق ہے کہ اللہ کی بندگی کو اپنے تشخص کی واحد بنیاد بنائیں اور رسول اللہ ﷺ کے فیض اور تعلیم وصحبت سے صحابہ کرام ؓ اس بات کو صرف ذہنی سطح پر ہی نہیں بلکہ اپنے کل وجود کی قبولیت کے ساتھ سیکھ گئے تھے کہ بندگی کے تمام مراتب' اطاعت و پرستش کے تمام مدارج کو احسان کے ساتھ انجام دیتے رہنے کا نام ''تزکیہ'' ہے۔ صحابہ ؓ کے لیے تزکیۂ نفس کوئی علمی' ذہنی یا جزوی مسئلہ نہیں تھا' صحابہؓ کے لیے تزکیۂ نفس بندگی میں سچے ہونے کی ضرورت تھی۔ بندگی میں ان کی صداقت اور اخلاص نے تزکیہ کو گویا ان کی زندگی میں جاری تمام اعمال وافعال' تمام خیالات واحساسات کی واحد بنیاد بنا دیا تھا' اور یہی سبب ہے اُن کو یہ دوئی پیش نہیں آئی۔ صحابہؓ ہی نہیں بلکہ تابعینؒ' تبع تابعینؒ تک کو یہ دوئی پیش نہیں آئی جس کا ہمیں آج بہت شدت سے سامنا ہے۔ ہم مسجد میں جو ہوتے ہیں وہ دکان میں نہیں ہوتے۔ صحابہ کرام ؓ کے یہاں ان کی زندگی کا پورا دروبست بندگی پر محیط تھا' ان کی presence حالت رکوع میں بھی وہی ہوتی تھی جو خرید وفروخت میں ہوتی تھی۔ وہ حضورِ حق کے مسلسل تجربے سے گزار دیے گئے تھے۔ ان کا ہر عمل' چاہے وہ دنیوی ہو چاہے معروف معنوں میں دینی' موجبِ تزکیہ ہوتا تھا۔

صحابہ کرام ؓ کے فضائل میں ایک لاشریک فضیلت یہ ہے کہ ان کا سونا' جاگنا' دینی و دنیوی ہر عمل نتیجے کے اعتبار سے تزکیہ ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو تزکیہ کی کوشش کرنے والے' سچی نیت رکھنے والے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسے اختیار کرے' اور اس کے لیے ناگزیر ہے کہ صحابہ کرام ؓ کو اپنا model بنا کر تزکیہ کا وہی منہاج اختیار کرے جو رسول اللہ ﷺ کی شانِ تربیت سے اس جماعت میں فعال حالت کے ساتھ منتقل ہوا' اور جس کو انہوں نے زندگی کے ہر گوشے میں کمال تک پہنچا کر دکھایا۔ تزکیہ کوئی ذہنی فیصلہ' کوئی جزوی ارادی مراد یا ٹھیٹھ معنوں میں کوئی خاص عمل نہیں ہے۔ تزکیہ میرے وجود کی تمام قوتوں سے صادر ہونے والا فیصلہ ہے' جس کی میں اپنی زندگی کے ہر ہر عمل میں پابندی کرتا ہوں' اور اس کے نتیجے میں شخصیت کی اس تکمیل تک پہنچنا چاہتا ہوں' جہاں جو حالت مجھے اللہ کے حضور سجدے میں میسر ہے' عین وہی حالت مجھے کھیل کود میں بھی حاصل رہے۔ اللہ سے تعلق کی جو یکسوئی اور شدت مجھے تلاوت میں حاصل ہے' وہی یکسوئی اور شدت مجھے اخبار پڑھتے ہوئے بھی نصیب رہے۔ اس کو کہتے ہیں تزکیہ۔

اس تزکیہ کو اپنا مطلوب بنائے بغیر تزکیہ کی جزوی تدابیر اختیار کر کے ہم اس مقصد کو



حاصل نہیں کر سکتے۔ اس بات کو سادہ الفاظ میں اس طرح کہا جائے گا کہ اللہ کی طرف سے جن امتحانات کو پاس کرنے کے لیے مجھے دنیوی زندگی دی گئی ہے' ان امتحانات کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اپنی ہر حیثیت کو اپنی بندگی کے تابع رکھوں۔ میرا شوہر ہونا' باپ ہونا' امیر ہونا' مامور ہونا' انقلابی ہونا' خلوت نشیں ہونا' غرض میری زندگی کے جتنے بھی عنوانات اور جتنے بھی تشخصات ہیں' یہ سارے عنوانات اور پہچانیں ایک دائرے میں اکٹھی ہو کر باہم مربوط رہیں' اور وہ ہے بندگی کا دائرہ۔ میرے تعارف کی واحد اساس میری عبودیت بنے' میری شخصیت کا واحد جوہر بندگی بنے' یہ تزکیہ کا مقصود ہے' اور اس کے بغیر تزکیہ بے معنی اور خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے' کہ میں بعض دینی اعمال' بعض دینی خیالات کو polish کرتا چلا جاؤں اور اپنے وجود کے دیگر functional حصوں کو' اپنی شخصیت کے دیگر تشخصات کو بندگی کے دائرے یا بندگی کے binding discipline کے باہر رکھوں۔

## تزکیہ اپنے کمالات میں کیسا ہوتا ہے؟

غیر انبیاء میں اوّل آفرینش سے قیامت تک حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ اُس ہستی کی مثال ہے۔ حدیث میں ہے ایک مرتبہ حضرت حنظلہ ؓ پریشانی میں تھے' وہ گزرتے چلے گئے' حضرت ابوبکر صدیق ؓ راستے میں تشریف فرما تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو ایک نظامِ معاشرت ترتیب دے کر عملاً جاری فرمایا تھا' اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ راستے کا حق یہ ہے کہ بیٹھے ہوئے کو چلنے والا 'سلام' کیا کرے اور صحابہؓ اس بات کی بہت زیادہ پابندی کرتے تھے' بلکہ اتنی پابندی کرتے تھے کہ دو صحابیوں کے بیچ میں اگر کوئی پتھر آ جاتا تھا' ایک اِدھر سے ہو کر گزرے اور دوسرے اُدھر سے گزرے' تو دوبارہ ایک دوسرے کو دیکھنے پر سلام کرتے تھے...... تو حضرت حنظلہ ؓ نے سیدنا ابوبکر ؓ کو نہیں دیکھا اور سلام کیے بغیر گزر گئے' تو یہ بات سیدنا ابوبکر ؓ کو عجیب لگی۔ ذرا غور کریں' کیا معاشرت تھی' انہیں یہ عمل عجیب لگا' انہوں نے آواز دی اور کہا: بھئی تم کس غائب دماغی میں چلے جا رہے تھے؟ سلام ہی نہیں کیا......! سیدنا حنظلہ ؓ نے کہا: میں تو ایک ایسی فکر میں پڑا ہوں کہ سب کچھ بھول بیٹھا ہوں۔ دریافت کیا: خیریت' کیا فکر لاحق ہے؟ حضرت حنظلہ ؓ نے جواب دیا: مجھے لگتا ہے کہ میں منافق ہو گیا ہوں' کیوں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اَقدس میں بیٹھتا ہوں تو دل کی حالت کچھ اور ہوتی ہے اور بیوی بچوں میں چلا جاتا ہوں تو وہ حالت برقرار نہیں رہتی...... یہاں

یہ بات بہت قابلِ توجہ اور یاد رکھنے کے لائق ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک ''مسائل'' کیا ہیں؟ ان ''مسائل'' کو متاعِ حیات بنائے بغیر تزکیہ کے جھوٹے نعرے تو لگائے جا سکتے ہیں' اس مزاج کو پیدا کیے بغیر تزکیہ کی طرف سنجیدہ پیش رفت نہیں ہو سکتی۔

حضرت حنظلہ ؓ کہنے لگے یہ جو مجھے روگ لگ گیا ہے یہ بتاتا ہے کہ (نعوذ باللہ) میں منافق ہو گیا۔ اب یہاں ذرا غور کیجیے' اس بات کے سامع ہیں سیدنا صدیق اکبرؓ' جنہیں اپنے جنتی ہونے پر ایمان رکھنا واجب تھا' یعنی ان کا جنتی ہونا ان کے لیے ایمان کا درجہ ہونا چاہیے تھا' کیوں کہ وہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں' لیکن اس کے باوجود انہوں نے کہا: ارے بھئی! یہ حالت تو مجھے بھی پیش آتی ہے۔ اس کا مطلب ہے میں بھی منافق ہو گیا! (نعوذ باللہ من ذالک)...... یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے لیے منتخب کیا تھا۔

آج ہماری صورت حال یہ ہے کہ اوّل تو منبر پر ایک وعظ کرنے والا اور مریدوں میں دم درود کرنے والا' اپنے اندر ایسی مخلصانہ دور بینی نہیں پیدا کر سکتا کہ وہ اپنے آپ کو ان معیارات پر پرکھتا رہے کہ میرا دل کہاں' کس حال میں ہے؟ اپنے دل کے احوال اور ان احوال کے درمیان کسی عارضی یا مستقل عدم توازن پر نظر رکھنا اور اس کے نتیجے میں ایک فکر پال لینا کہ میں کس طرح اس عدم توازن کو دور کر سکتا ہوں...... یہ تو گویا اب دینی افکار سے' دینی طبائع سے' دینی شخصیات میں سے' الا ماشاء اللہ' خارج ہو چکا ہے' اور اگر آج بالفرض تکلفاً یا نفسیاتی سطح پر ایک عام آدمی کو بھی یہ وسوسہ پیش آ جائے کہ میں منافق یا کافر ہو گیا ہوں؟ تو وہ نہایت درجے کے حسنِ استدلال کے ساتھ' طرح طرح کی دلیلوں کے ساتھ' اس وسوسے کو اپنے طور پر ردّ کر کے مطمئن ہو جائے گا' لاحول ولاقوۃ میں کہاں سے منافق ہو گیا! اس کے دس بہانے بنا لے گا۔ یعنی وسوسۂ نفاق اور شائبۂ کفر کو ٹالنے کے لیے بہت مضبوط دلیلیں خود سے لے آئے گا۔ ایسا وسوسہ وقتاً فوقتاً سلیم الطبع لوگوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ (عام لوگوں میں) اوّل تو اب پیدا نہیں ہوتا' لیکن ہو بھی تو وہ شخص نہایت فصیح و بلیغ طریقے سے اس سے جان چھڑا لے گا۔

یہ ابوبکرؓ و حنظلہؓ کی گفتگو ہے۔ سیدنا ابوبکر ؓ معلم صحابہؓ ہیں' اور یوں سمجھ لیں صحابہ میں پیر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے حضرت حنظلہ ؓ کو تسلی دینے کی بجائے فوراً اس نقص' اس خطرے اور اس شائبے کو اپنی طرف منتقل کر لیا' اپنے آپ کو اس کا مصداق بنا کر کہا یہ تو واقعی



بات ہے' مجھے بھی پیش آتی ہے۔ اس کا مطلب ہے میں بھی (نعوذ باللہ) منافق ہو گیا!

اب وہ دونوں ایک مشترکہ فکرمندی میں مبتلا ہو گئے اور اس فکرمندی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضرت حنظلہ ؓ پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضری کے لیے جا رہے تھے۔ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر دونوں نے نہایت درجے کی فکرمندی اور خوف کے ساتھ اپنی یہ صورت حال بتائی۔ آپ ﷺ متبسم ہوئے اور فرمایا: کیا بات کرتے ہو' مؤمن کا دل خدائے رحمٰن کی دو انگلیوں میں ہوتا ہے' اسے وہ اِدھر اُدھر پلٹتا رہتا ہے' یہ عین حالت ایمان ہے۔ (روایت بالمعنی) اور جو تسلی دینی تھی وہ ارشاد فرما دی۔ اس سے فوراً تسلی بھی ہو گئی۔

آپ یہ دیکھیں کہ جو نفس کے لیے سب سے خطرناک وسوسہ ہو سکتا ہے اس کی قبولیت بھی ''خیر البشر بعد الانبیاء'' میں فوراً ہو گئی' اور اس وسوسے کے رد کرنے کے لیے جو 'اتھارٹی' چاہیے' اس authority کی طرف سے کہا گیا ایک سادہ سا کلمہ اس کے ازالے کا حتمی ذریعہ بن گیا۔ اب ذرا سی دیر کے لیے یہاں ٹھہر کر یہ بھی سوچیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت حنظلہ ؓ کو تسلی کیوں نہیں دی؟ کیا ان کا دماغ (معاذ اللہ) اتنا بھی نہیں تھا جتنا آج کل ایک مولوی کا دماغ ہے؟ ان کی سمجھ (نعوذ باللہ) نفس اور اس کے احوال پر اتنی بھی نہ تھی جتنی آج کل کے دکھاوے کے دین داروں میں ہوتی ہے؟ یعنی وسوسوں کو ٹالنے کی تدبیر۔

جب میں ذاتی طور پر اس واقعے پر غور کرتا ہوں تو شرمندگی اور ندامت تو فطری (natural) ہے' صحابہ کرام ؓ کی اس باطنی بصیرت پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہوں ''یا اللہ یہ لوگ تو بندگی کی حقیقت سے بنائے گئے تھے!''...... اگر کوئی یہ کہتا ہے مجھے کوئی ایسا وجود بتا دو جو بندگی کے ''آب و گل'' سے بنایا گیا ہو' جو بندگی کی حقیقت سے مجسم کیا گیا ہو' تو جب تک آپ غیر انبیاءؑ میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا نام نہیں لیں گے اس وقت تک آپ کا جواب نامکمل رہے گا۔ یہ گویا وہ لوگ تھے جو درجۂ عبودیت پر خلق کیے گئے تھے اور انہیں بھی وہ عیب جو عبودیت کے سب سے زیادہ منافی ہے یعنی ''نفاق'' اس کا خدشہ اور دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کیا یہ منتہائے امید و بیم نہیں ہے؟ کیا یہ ہم پر یہ واضح نہیں کرتا کہ نفس میں تزکیہ کی خواہش کے لیے کیسا مزاج چاہیے؟ نفس کا تزکیہ بہت آسان ہے' لیکن تزکیۂ نفس کی طلب میں اوّلاً صادق ہونا ضروری ہے۔ آیا یہ دکھاوے کے لیے تزکیۂ نفس کی طلب کر رہا

ہے؟ ذہانت میں ترقی کے لیے تزکیۂ نفس کی طلب کر رہا ہے؟ یا یہ واقعتہً اپنے وجود کی انتہائی گہرائی کے ساتھ اپنی اصلاح اور تکمیل کا طالب ہے۔

## تزکیہ کے لیے مطلوبہ مزاج

جس کے لیے اپنی اصلاح اور اپنی تکمیل مطلوب ہو' اس مزاج کی پہچان کے لیے کچھ خاص اور ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔ ہم یہ دیکھیں کیا ہم اپنے آپ کو اس سطح تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ تزکیہ نفس کی طلب میں صادق ہو جائیں یا اپنے نفس کو سنوارنے کی خواہش میں مخلص ہو جائیں؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر اس خیال کو پیدا کریں اور اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں کہ ''میرا ہر کمال مفروضہ ہے' ہر نقص یقینی ہے' موجود کمالات مفروضے ہیں' غائب نقائص حقیقی ہیں''......تو جو شخص یہ مزاج پیدا کر لیتا ہے کہ وہ اپنے کمالات کو موجود ہوتے ہوئے بھی غیر موجود پائے اور اپنے معائب اور نقائص کو غیر موجود ہوتے ہوئے بھی حاضر اور کارفرما سمجھے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ آدمی تزکیۂ نفس کا سچا طالب ہے۔ اگر ہم پہلے ہی قدم پر self defensive ہو گئے' یعنی ہم پہلے ہی قدم پر تاویل اور حیلے میں پڑ گئے تو ہم تزکیہ کے طالب نہیں ہیں' بلکہ ہم اپنی شخصیت کو اپنی مرضی کے مطابق بنانا چاہتے ہیں' یعنی اپنی شخصیت کو اپنے مالک کی رضا کے تابع رکھ کر تعمیر نہیں کرنا چاہتے۔

پہلی بات میں نے عرض کی کہ اگر ہم غیر موجودہ نقائص کو بھی اپنے اندر موجود دیکھیں' اسی طرح اگر کوئی ہماری شخصیت کے بارے میں اعتراض کرے کہ ''آپ برے آدمی ہیں'' تو ہمیں یہ برا نہ لگے' ایک جذبۂ احسان مندی اور ایک حسِ خوف کے ساتھ ہم دیکھیں کہ ہاں! میں تو برا آدمی ہوں۔ اور فوراً متوجہ ہوں اس برائی کی طرف' اور پھر بہت دیر تک غور وفکر کے بعد اگر وہ برائی ہم اپنے اندر نہ پائیں تو بھی اس کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے اس برائی کے امکان سے ہمیں بچا لیا۔ کیوں کہ اس برائی کا یقینی امکان ہمارے اندر موجود ہے۔ اسی طرح جب کوئی آپ کی تعریف کرے تو اس تعریف کو مکمل نہ ہونے دینے کی شدید خواہش کرنا بھی اس کا دوسرا اہم پہلو ہے' کیوں کہ جو تعریف سے خوش ہو وہ نفس کے چنگل سے نہیں نکل سکتا۔ تزکیہ نام ہے اپنے نفس کی محبت کو اپنے نفس سے خارج کرنے کا۔

فنی اعتبار سے یہ بات یوں ہوگی کہ جس آدمی میں اپنی تنقید پر ناراضی یا defending



system بیدار ہو جائے وہ تزکیہ کا طالب نہیں ہو سکتا' یعنی جو آدمی self defensive رہنے کا عادی ہو وہ تزکیہ کے لیے نااہل ہے۔ اسی طرح جو آدمی اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہو' وہ تزکیہ کے لیے دوسری طرح کی نااہلی کا شکار ہے۔

اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے ''انسان کی خلوت اُس کی جلوت سے لامحدود گنا اچھی ہو''۔ یعنی جس کی خلوت اُس کی جلوت سے اچھی نہیں ہے تو وہ تزکیہ کے لیے نااہل ہے' وہ تزکیہ کی کوشش کا آغاز ہی نہیں کر سکتا' اس کے اندر تزکیہ کی خواہش ہی نہیں پائی جاتی۔ چاہے وہ ظاہر میں انقلاب لے آئے' ساری دنیا کو دارالسلام بنا دے' اگر اس کی خلوت اس کی جلوت سے اچھی نہیں ہے تو اس کے کارنامے اپنی جگہ' یہ ناقص ہے۔ چناں چہ دوسرا درجہ خلوت کا جلوت سے اچھا ہونا' یہ لازم ہے۔ یہ اُس مزاج کی مستقل نشانی ہے اور وہ مزاج پیدا کرنے کا دوسرا تقاضا ہے جو تزکیہ کا طالب ہو اور جس پر تزکیہ کی کوششیں مفید طور پر اثر کر سکیں۔ اگر مزاج میں یہ دو چیزیں نہیں ہوں گی تو تزکیہ کی طلب سچی نہیں ہوگی' اور تزکیہ کی methodology کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔

میرے خیال میں خاص طور پر وہ حضرات جو دین کی اجتماعی اقدار کی تشکیل کے لیے سرگرم رہتے ہیں' جو دین کے اجتماعی مقاصد کو حاصل کرنے کی مجاہدانہ جدوجہد کرتے ہیں' جو اپنے کام کے اعتبار سے اُمت کے محسن ہیں' ان لوگوں کو خاص طور پر یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ ان کی خلوت ان کی جلوت سے اچھی ہے یا نہیں؟ اگر ان کی خلوت جلوت سے اچھی نہیں ہے' پھر ان میں تحریکی قابلیتیں ہوں گی' لیکن دین داری نہیں۔ دین دار آدمی وہ ہوتا ہے جو خلوت کو محبوب رکھے اور جلوت کو حکم سمجھ کر صحیح کرے۔ یہ مزاج میرے لیے ایک وسیلہ بنے گا جب میں اللہ سے عرض کروں گا کہ یا اللہ! اپنی طبعی رغبت کے باوجود بہت زیادہ عبادات تنہائی میں اس لیے نہیں کر سکا کہ آپ کا حکم مجھ تک پہنچا کہ باہر نکل کر میرے نام کو اونچا رکھو' تو میں نے اپنی طبعی رغبت کو آپ کے حکم پر قربان کر دیا۔ اگر یہ مزاج نہیں ہے تو بہت زیادہ ڈر ہے کہ آدمی کا 'حق' بھی اُس کے نفس کے تابع ہو' آدمی کا تصورِ حق گویا اُس کے نفس ہی کا خلق کردہ ہو۔ مثال کے طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایک ٹائٹل ہے کہ ''یہ لوگ راتوں کے راہب اور دن کے شہ سوار تھے'' (هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ)۔ یعنی ان کی راتیں عبادت میں اور دن جہاد میں گزرتا تھا۔ اگر ہم نے دن مجاہدوں والا اختیار کر لیا ہے اور رات راہبوں والی

choose نہیں کی تو دن کا جہاد بے معنی ہے‘ اور اگر ہم نے رات راہبوں والی منتخب کر لی ہے اور مجاہدوں والا دن اختیار نہیں کیا تو رات کی رہبانیت کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

## تزکیہ کا اصل ہدف

اس ساری بحث سے جو ایک علمی اور نفسیاتی اصول برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نفس میں تزکیہ کا اصل ہدف اعمال نہیں ہیں‘ بلکہ نفس میں تزکیہ کا آغاز ہمیشہ طبیعت سے ہوگا۔ اگر طبیعت میں تزکیہ کی کیفیات نہیں ہیں تو اعمال کی تمام تر کثرت‘ درستی اور خیالات کی تمام تر صحت اور کاملیت بے فائدہ ہے۔ یہ انسان کی طبیعت ہے جو اُسے کسی اصول سے وابستہ یا غیر متعلق رکھتی ہے۔ انسانی فیصلوں میں استقلال‘ دوام اور تسلسل پیدا کرنے والی واحد قوت اس کی طبیعت ہے۔ طبیعت کا تزکیہ ضروری ہے‘ طبیعت کے سدھارنے کا اہتمام ضروری ہے۔ ذہن کا عقائد پر راضی ہونا‘ اعمال کا احکام سے متعلق رہنا زیادہ بامعنی اور productive نہیں ہوسکتا۔ طبیعت کے تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے تعلق‘ اللہ کے رسول ﷺ سے تعلق‘ اللہ کے دین سے تعلق طبیعت کے لیے منتہائے رغبت بن جائے۔ میرے لیے سب سے بڑی کراہت اللہ سے دوری ہو اور میری سب سے بڑی رغبت اللہ کا قرب ہو۔

مختصراً یہ کہ اس ضروری جوہر کو طبیعت میں راسخ کیے بغیر دین کی عقائدی یا عملی مرادات کو بھی دین کے متعین کردہ معیار پر حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ کوئی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احسان کو صلوٰۃ میں اس طرح ذکر فرمایا ہے گویا یہ نماز کی طرح فرض ہے۔ احسان کوئی مستحب امر یا کوئی زائد وصف نہیں ہے‘ بلکہ احسان نماز کی main body کا حصہ ہے اور نماز کے حکم کی ’’مراد‘‘ ہے۔ احسان کے بغیر نماز‘ نماز نہیں ہے۔

اگر ہم اپنی طبیعت کو تزکیہ کے عمل سے نہیں گزارتے تو اس درجۂ احسان کا حصول ممکن نہیں ہے اور طبیعت کی شمولیت کے بغیر اس کے حصول کا کوئی ایک راستہ بھی طے کرنا ممکن نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تزکیۂ نفس کا اصل مدار تزکیۂ طبیعت پر ہے۔ جس کی طبیعت کا تزکیہ نہیں ہوگا‘ اس کا عملی تزکیہ گویا شروع ہی نہیں ہوا۔

## تزکیہ کی تین بنیادیں

ہمارے اَسلاف کا مزاج خشیت پر مبنی تھا۔ سلف سے ظاہر ہے کہ مرادِ اوّل صحابہ کرام ؓ ہیں۔ صحابہؓ کے یہاں خشیت ان کی دین داری کا جوہر تھی۔ صحابہؓ کا دینی وجود خشیت کے جوہر پر



تشکیل پاتا تھا۔ صحابہؓ کے بعد کے ادوار میں خشیت کی جگہ ’’علم‘‘ نے لے لی۔ علم کے ادوار گزرنے کے بعد علم کی replacement محبت بنی۔ یہ تین ادوار ہیں جنہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے ’’محفوظ زمانے‘‘ تھے۔ محفوظ زمانوں سے میری مراد ہے جب دین انفرادیت اور اجتماعیت کی تشکیل کا واحد سبب تھا۔ یعنی جب ہم کہتے ہیں ’’محفوظ زمانہ‘‘ یا ’’اچھا زمانہ‘‘ تو اس سے مراد ہوتی ہے: ’’ہمارا دین اللہ کے فضل سے اتنا فعال اور نتیجہ خیز تھا کہ ہماری نفسیات اور ہماری تہذیب دونوں دین کے اصول پر بنے تھے۔‘‘

یہ ان زمانوں کی بات ہے جب فرد بھی دین کے سانچے میں ڈھلا کرتا تھا اور معاشرہ بھی دین کے اصول پر کھڑا تھا۔ ان زمانوں میں تزکیۂ نفس کی تین حالتیں تھیں‘ یعنی ’’نفسِ مزکّی‘‘ کے تین احوال تھے۔ صحابہؓ کے احوالِ تزکیہ میں خشیت غالب تھی‘ تابعین اور تبع تابعین کے اسبابِ تزکیہ میں علم غالب تھا اور اس کے بعد محبت غالب ہوئی‘ جہاں سے تصوف شروع ہوا۔ لیکن ان تینوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ علم نے آ کے خشیت کو خارج کر دیا‘ محبت نے آ کے علم اور خشیت دونوں کو دیس نکالا دے دیا۔ بس ان تینوں عناصر میں غلبے اور ترجیح کی بات ہے‘ اور وہ غلبہ اور ترجیح بھی مزاجی ہے نہ کہ ذہنی۔ اس سے جو اصول نکلتا ہے یا جو مدد ملتی ہے وہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کی تین بنیادیں ہیں: خشیت‘ معرفت اور محبت۔ ان تین بنیادوں میں سے جس جزو کا بھی غلبہ ہو جائے‘ دوسروں کی نفی کیے بغیر‘ تو وہ نفس کو مزکّی بنانے کی ضمانت دیتا ہے۔ اگر خشیت دو پر غالب ہے‘ دونوں کو موجود رکھتے ہوئے‘ تو بھی تزکیۂ نفس نقد ہے۔ اگر معرفت مرکزی حیثیت اختیار کر جائے تو بھی نفس کا سدھار یقینی ہے‘ ان شاء اللہ۔ اگر محبت باقی دو کا مدار بن جائے تب بھی نفس کا مزاجِ بندگی میں ڈھل جانا آسان ہے۔ ان تینوں ’’جواہرِ نفسِ مزکّی‘‘ کو نشو ونما دینے کی ذمہ داری اٹھایئے۔ اللہ کی خشیت‘ اللہ کی محبت اور اللہ کی معرفت‘ یہ نصابِ تزکیہ ہے۔

تزکیہ کی تمام تفصیلات مزاج کے فرق کی رعایت رکھتے ہوئے ان تین لفظوں میں ہیں۔ تزکیہ انہی تین بنیادوں پر ہوگا‘ چاہے ان تین بنیادوں میں سے مزاجی مناسبت کسی ایک سے ہو۔ جب تک ہماری مزاجی و ذہنی مماثلت و مناسبت ان تین اقدارِ تزکیہ سے نہ ہوگی‘ اس وقت تک تزکیہ مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں رہے گا۔ یہ تین اقدار اصلاً حق تعالیٰ سے تعلق کی تین حالتیں ہیں۔ یہ تعلق مع الحق کے تین مستقل آداب ہیں۔ اگر ’’تعلق مع الحق‘‘ ایک فعال حالت میں اور

ایک محفوظ اور مسلّم method کے ساتھ ہمارے اندر functional اور operative نہ ہو تو تزکیہ کے عمل کا کوئی لائق اِعتماد مفہوم نہیں ہے۔

## ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور تنظیم اسلامی

اب ایک بات میں عاجزانہ اپنائیت سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قبلہ ڈاکٹر صاحب سے ایک شخصی درجے پر تعلق کا تجربہ ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تنظیم کی جو داخلی بناوٹ ہے وہ اس تعلق کے نتیجے میں میری بساط بھر میرے علم میں ہے، اور میں ان کی بنائی ہوئی تنظیم کے افراد کو دیگر جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ potent سمجھتا ہوں، یعنی جن میں دینی امکانات زیادہ ہوں، اور اس تنظیم کے جو عملی اصول ہیں ان میں جامعیت دیکھتا ہوں۔ یعنی یہ تنظیم تزکیہ کے جس مقصود کو حاصل کرنا چاہتی ہے وہ تزکیہ کا ایک مستقل مقصود ہے۔ یعنی ''انفس کو بھی حق کے تابع کرو اور آفاق کو بھی حق سے مغلوب رکھو''۔ عام طور پر جو دینی تحریکیں ہوتی ہیں یا دینی تحریکیوں کے پیچھے کارفرما جو فکر ہوتی ہے، اس میں اصلاحِ نفس کا پہلو بہت بڑی حد تک دب جاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی achievement ہے، جو فکری سطح پر ہوئی ہے اور اس فکر سے پیدا ہونے والی جماعت کے مزاج کا حصہ بھی بن گئی ہے۔ آپ حضرات اگر اس سلسلے میں کچھ زیادہ انہماک اور نسبتاً کچھ زیادہ پھیلاؤ اور قدرے علمی گہرائی کے ساتھ کام کریں تو ممکن ہے آپ کو آپ کے بعض خارجی نتائج حاصل ہونے میں دیر لگ جائے، لیکن اس سلسلے میں آپ تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ رکھنے کے سلسلے میں مجھ ایسے لوگوں کے مقابلے میں بہت بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے مشاہدے کی حد تک تزکیہ کے مقصد کو شدت کے ساتھ ہمیشہ مدِنظر رکھنے کی ضرورت دو طبقات کو زیادہ ہے۔ ایک وہ جو تعلیمِ دین سے وابستہ ہیں، یعنی معلّمین، اور دوسرے تحریکی طبقات کو تزکیہ کی ضرورت کا قائل اور اس پر عامل ہونے کی ضرورت عام آدمی سے زیادہ ہے، لیکن یہ ضرورت حدِ مطلوب تک پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔

**و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین!**

## سوال و جواب

سوال: بنیادی طور پر ایک عام آدمی کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ تصوف دین سے متصادم ہے،



کیوں کہ آج جو کچھ مزاروں پر ہو رہا ہے، مثلاً قوالیاں اور عرس وغیرہ، اس کو ذرا واضح کر دیں۔

جواب: جی ہاں! تصوف اپنے موجودہ institutions میں اور اپنے حاضر مظاہر میں ایک خطرناک روایت بن چکا ہے، جو بے معنی اور مضر بھی ہے۔ جس قصباتی تصوف سے ہمیں واسطہ ہے، اس کا جلد از جلد فنا ہونا ہی اسلام اور مسلمانوں کے لیے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف کو defend کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ یعنی اگر ہم فقہ والے سے پوچھیں کہ فقہ کے کیا فائدے ہیں تو وہ کچھ ادارے اور کچھ لوگوں کے نام بتا دے گا، ایک روایت کا تسلسل بتا دے گا۔ مگر تصوف والے سے پوچھا جائے تو اس کے پاس اپنے جواز اور validity ثابت کرنے کے لیے صرف ماضی موجود ہے۔ تو اس صورتِ حال میں میں نہیں سمجھتا کہ اس کا دفاع کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنا چاہیے۔ جہاں تک بات ہے ان حضرات کی وحشت کی تو اگر وہ موجودہ مظاہر کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہے، تو وہ وحشت اپنے ہر جزو میں ٹھیک ہے اور وہ ہونی بھی چاہیے، کیوں کہ اپنے موجودہ مظاہر میں تصوف بڑی حد تک، الا ما شاء اللہ، سنت کی راہ میں رکاوٹ بن چکا ہے اور بڑی حد تک دینی ذوق کی آبیاری کو روکنے والا ادارہ بن چکا ہے۔ میں بھی اس وحشت میں شریک ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ روایت اپنے تمام موجود مظاہر کے ساتھ ایک ایک کر کے ختم ہو جائے، تاکہ تزکیۂ نفس کا عمل ان نام نہاد ٹھیکے داروں کے ہاتھ سے نکل کر مسنون فضا میں داخل ہو سکے۔

سوال: احسان کیا ہے؟

جواب: احسان تزکیہ و تصوف کا متبادل لفظ ہے۔ احسان ایک حالِ دید ہے، دید کے بغیر۔ احسان کا مطلب ہے دید کا حال جو دید کا دعویٰ کرنے کی اجازت نہ دے۔ حالِ دید تین ہی نتائج مرتب کرے گا۔ ایک مزاج کے لیے محبت کو بڑھا دے گا۔ دوسرے مزاج کے لیے خشیت کو بڑھا دے گا۔ تیسرے مزاج کے لیے معرفت کا سبب بنے گا۔ تو اصل چیز ''احسان'' ہے، اللہ کے حضور میں رہنا اور اللہ کو استحضار میں رکھنا۔ اس سے بچنے کے لیے بعض لوگ مختلف activities اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی دینی زندگی کی مصروفیات اس فریضے سے بچنے کا بہانہ بن جاتی ہیں۔

سوال: رسول اللہ ﷺ کی جماعت کا تزکیہ تو ہو چکا تھا، ہم مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کس طرح explain کریں گے؟

جواب: یہ چیز بہت ہی natural way میں دیکھی جا سکتی ہے کہ بنائے مشاجرات نفس

نہیں تھا۔ اگر نہ بنائے اتفاق نفس ہو اور نہ بنائے مشاجرات نفس ہو تو یہ نفسِ مزکی کے مظاہر ہیں۔ اس کے لیے صحیح الفکر‘ کامل القول‘ اور منتہی الحال ہونا ضروری نہیں ہے‘ معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ نفس پروری کو بے نفسی سے طاقت ور نہیں ہونا چاہیے‘ نہ کہ نفس پروری کے داعیہ کا ازالہ مقصود ہے۔ صرف اور صرف حق‘ خیر اور جمال کا غلبہ ہونا چاہیے باطل‘ شر اور بدصورتی پر۔

**سوال:** آپ نے فرمایا حضوریٔ قلب جیسی سجدے اور رکوع میں ہو وہی کھیل اور دوسری چیزوں میں بھی ہو۔ موجودہ دور میں فرض کریں ایک پیر صاحب ہیں‘ کسی غیر شرعی کام میں مصروف ہیں‘ ایک عام آدمی جب ان پر حرف گیر ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے یہ معرفت کی باتیں ہیں آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اُس وقت ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ ہم ان کو پہچان سکیں؟

**جواب:** قرآن وسنت‘ صورت اور حقیقت دونوں پر حاکم ہیں۔ کوئی حقیقت منظور نہیں جب تک وہ بلا تاویل قرآن وسنت سے ثابت نہ ہو‘ اور کوئی صورت منظور نہیں جب تک کہ وہ بلا ترمیم قرآن وسنت سے متبادر نہ ہو اور تسلسل کے ساتھ نہ پہنچی ہو۔ ان دو اصولوں پر قائم رہیں کہ میرے مذہب کی آفاقیت کی سند بھی وہیں سے ہونی چاہیے اور میرے دین کا انفسی دروبست یعنی باطنی احوال بھی وہاں سے واضح طور پر ماخوذ ہونے چاہئیں‘ اور جو ذرائع ان دو سندوں نے فراہم کیے ہیں‘ انہی سے پیدا ہونے چاہئیں اور اس پر کوئی compromise نہیں ہونا چاہیے۔

**سوال:** اس صورت حال میں کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟

**جواب:** اصل چیز ہے اپنے گھر کو بدلنا‘ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ہم اگر اپنے قریب ترین تعلقات میں بنیاد اللہ کو بنالیں‘ اگر اپنے عزیز ترین مفادات میں مقصود اپنے اللہ کو بنالیں‘ تو ہماری ساری خرابیاں وعظ ونصیحت کے بغیر دور ہو جائیں گی۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ فوری مفادات ہمیں عزیز ہیں اور مفاداتِ آخرت سے مناسبت رسمی سی رہ گئی ہے۔ اگر میں آج فیصلہ کر کے جاؤں اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو یہ جتادوں کہ میری اور تمہاری محبت غیر مشروط نہیں ہے‘ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں‘ لیکن یہ کچھ شرائط کے تابع ہے۔ اگر میں اپنے بچوں کو یہ باور کرادوں کہ میرا پورا نظامِ تعلق اللہ کے تعلق کی تفصیل کے علاوہ کچھ نہیں ہے‘ تو آپ دیکھ لیجیے گا...... اگر ہم سب متفق ہو کر یہ رویہ اختیار کرلیں تو دو سال کے اندر سوسائٹی کا موجودہ طاغوتی نظام گر سکتا ہے۔ آج اگر ہم چار باتیں طے کرلیں تو ہمیں ہمارے موجودہ ابتلا سے نکلنے کی ایک



ٹھوس بنیاد مل سکتی ہے‘ جس کے نہ ہونے سے ہم موجودہ ابتلا کا شکار ہیں:

۱) مجھے اپنے ہر موضوع کو مذہبی افادیت کا حامل اور ضامن بنانا ہے۔

۲) مجھے اپنے ہر تعلق کو تعلق مع الحق کا ذریعہ بنانا ہے۔

۳) مجھے اپنی خلوت کو اپنی جلوت سے اچھا رکھنا ہے۔

۴) مجھے اچھا پڑوسی بننا ہے۔

ان چار باتوں سے وہ معاشرتی اور نفسیاتی تزکیہ کی قوت پیدا ہوگی جو ہمیں ابتلا سے نکالنے کا سبب بن سکتی ہے۔

**سوال:** علم نافع سے کیا مراد ہے۔ کون سا علم ”علم نافع“ ہوگا؟

**جواب:** علم نافع تین بنیادوں پر ہوتا ہے:

۱) وہ علم جس کے نتیجے میں اللہ کی معرفت میں ترقی ہو۔

۲) وہ علم جو دنیا میں مفید ہو اور آخرت میں افادیت رکھے۔

۳) دنیا میں نفع دے اور آخرت میں مضر نہ ہو۔ یہ بھی علم نافع ہے۔

---

بقیہ: بحث ونظر

---

اس عمل میں انگلینڈ کی Enclosure movement نے تیزی دکھائی‘ جس کے تحت عوامی زمینیں بڑے زمینداروں کو دے دی گئیں جو زمین کو بھیڑیں چرانے کے لیے استعمال کرتے۔ کارل مارکس کے بقول ٹھیکے دارانہ تعلق کا عروج‘ زمیندار اور مزارع کے مزارعانہ‘ کاشت کارانہ تعلق کے ٹوٹنے سے جڑا ہے۔

دوسری طرف جاگیرداری نے سولہویں صدی تک سرمایہ داری کا گلا گھونٹے رکھا‘ لیکن پھر نئی ٹیکنالوجی اور ایجادات کی اچانک نمود‘ خاص طور پر زراعت اور سیاحت کے شعبوں میں‘ نے سرمایہ داری کی ترقی میں جان ڈال دی۔ جاگیرداری کے اختتام پر سب سے اہم تبدیلی سرمایہ دار تاجروں اور محنت مزدوری کرنے والوں کے درمیان دولختی (dichotomy) تھی۔

(جاری ہے)

# حُبِّ رسول ﷺ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حُبِّ رسول ﷺ وہ جذبہ ہے جس کے نتیجے میں ایک مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ہر عمل بلکہ ہر ادا پر دل و جان سے فدا ہو۔ اُسے کسی دوسرے شخص کے ساتھ روحانی یا جسمانی طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرح محبت نہ ہو۔ اُسے رسول اللہ ﷺ کا ہر طریقہ اور عمل سب لوگوں سے اور اُن کے ہر عمل سے زیادہ محبوب ہو۔ اگر کسی مسلمان کو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ایسی محبت نہیں تو اسے اس کی فکر کرنا چاہیے‘ کیونکہ اس طرح اُس کے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))(۱)

’’تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے باپ‘ بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔‘‘

ہر انسان کو اپنے بیٹے سے بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ اولاد ہی ہے جس کی خاطر وہ اپنا راحت اور آرام چھوڑ کر تکالیف برداشت کر لیتا ہے۔ اسی طرح اپنے باپ کے ساتھ ہر کسی کو محبت ہوتی ہے اور ہر سعادت مند شخص اپنے باپ کی خدمت ضروری سمجھتا ہے۔ یہاں باپ اور اولاد کے ساتھ ’’وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ‘‘ بھی فرمایا کہ اُس کی محبت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہونی چاہیے‘ خواہ وہ ماں ہو یا بیوی‘ بھائی بہن‘ عزیز و اقارب‘ دوست احباب ہوں یا کوئی اور۔ گویا مؤمن ہونے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس درجہ کی محبت ضروری ہے۔ دنیا میں انسان طرح طرح کی محبتوں میں گرفتار ہوتا ہے‘ یہ اُس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ اُسے اپنے ماں باپ‘ بیوی بچوں‘ مکان‘ جائیداد‘ مال و دولت‘ بھائی‘ بہن‘ عزیز و اقارب‘ دوست احباب سے محبت ہوتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب حب الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب وجوب محبة رسول اللہ ﷺ ......



اللہ کے رسول ﷺ کی محبت سے زیادہ تو نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ بڑے خسارے میں ہے‘ بلکہ اُسے تو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾ (التوبۃ)

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ‘ تمہارے بیٹے‘ تمہارے بھائی‘ تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘ تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں‘ اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے‘ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں‘ (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ‘ اس کے رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد سے‘ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

یعنی اگر رسول اللہ ﷺ کی محبت کا تقاضا پورا کرنے میں کنبہ برادری حائل ہو‘ یا تجارت کے مندہ پڑ جانے کا خطرہ ہو‘ یا آمدنی کم ہو جانے کا خوف ہو‘ یا اچھی رہائش چھوٹ جانے کا ڈر ہو تو پھر خدا کی طرف سے سزا کا انتظار کرو۔

قرآن اور حدیث کی یہ واضح‘ ٹھوس اور لاریب تعلیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو مخلص مسلمان تیار کیے اگر اُن کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایمان میں کامل تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اُن کو سچی محبت تھی جو ہر دوسری چیز سے بڑھ کر تھی۔ ان کا ہر عمل حُبِّ رسول کا مظہر تھا۔ جنگ اُحد کے دن خبر اڑ گئی کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ مدینہ کی عورتیں آہ و نالہ اور فریاد کرتی ہوئی مدینہ منورہ سے باہر نکلیں۔ انصار کی ایک عورت جس کا بھائی‘ باپ‘ شوہر اور بیٹا جنگ میں شامل تھے‘ اُس کو بتایا گیا کہ وہ سب شہید ہو چکے ہیں‘ مگر وہ پوچھتی رہی کہ رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا وہ آ گئے ہیں۔ وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور آنحضرت ﷺ تک پہنچ گئی اور آپؐ کا دامن تھام کر کہنے لگی: یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میرا باپ‘ شوہر‘ بھائی اور بیٹا اس جنگ میں شہید ہو چکے ہیں‘ مجھے ہرگز کوئی غم و فکر نہیں ہے اس لیے کہ آپ زندہ و سلامت ہیں۔ آپؐ خیریت سے ہیں تو ہر مصیبت میرے لیے آسان ہے!

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آخری وقت آ پہنچا' تو اُن کی بیوی فرطِ غم سے آنسو بہانے لگی۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ یہ تو خوشی کا موقع ہے تم بھی خوش ہو جاؤ کہ کل صبح کے وقت میں اپنے محبوب سید المرسلین ﷺ' آپؐ کے صحابہ اور دوسرے احباب جو پہلے رخصت ہو چکے ہیں' اُن سے جا ملوں گا۔

قبیلہ عضل اور قارہ کے وفد نے غلط بیانی کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ اسلام لے آئے ہیں' اسلام کی تعلیم سکھانے کے لیے ہمارے ساتھ کچھ قاری بھیج دیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں قاریوں کا ایک گروپ اُن کے ساتھ بھیج دیا۔ راستہ میں مقام رجیع پر انہوں نے تمام قاریوں کو شہید کر دیا۔ صرف حضرت خبیب اور حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما بچ گئے' جنہیں اسیر بنا لیا گیا۔ مشرکین انہیں رسیوں میں جکڑ کر مکہ لائے۔ حضرت زید کو صفوان بن امیہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صفوان کا باپ اُمیہ بن خلف حضرت زید کے ہاتھوں ایک غزوہ میں قتل ہو چکا تھا' صفوان نے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے زید کو برسرِ عام قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ قتل گاہ میں ابوسفیان سمیت قریش کے تمام بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ اس موقع پر ابوسفیان نے پوچھا: زید تمہیں خدا کی قسم' سچ سچ بتانا کہ اگر تمہاری جگہ محمد (ﷺ) ہوں اور ہم ان کی گردن ماریں اور تم اپنے گھر میں محفوظ رہو' تو کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو؟ حضرت زید نے جواب دیا: اللہ کی قسم مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ محمد ﷺ کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر بیٹھا رہوں۔ ابوسفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا۔ کہنے لگا: محمدؐ کے اصحاب ان سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ دنیا میں کسی کے دوست ایسے جاں نثار نہیں۔ چنانچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔

ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا: ''آپؐ مجھے میری ہر چیز اور ہر شخص سے زیادہ محبوب ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: ''اپنی جان سے بھی؟'' حضرت عمر فاروقؓ نے ایک لمحہ توقف کیا اور عرض کیا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپؐ پر اپنی کتاب نازل فرمائی' آپؐ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! اب تم مؤمن اور مخلص بنے ہو۔''

حضور اکرم ﷺ کی سچی محبت آخرت کی فلاح پر منتج ہوگی۔ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی محفل میں بیٹھا لگاتار آپؐ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: تمہارا کیا حال ہے؟ اُس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان' میں آپؐ کے جمالِ جہاں آفرین سے لذت حاصل کر رہا ہوں' لیکن فکر مند ہوں کہ قیامت کے دن



اللہ تعالیٰ مجھے حضور ﷺ کی زیارت نصیب کرے گا یا نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا''۔ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یارسول اللہ ﷺ! آپ مجھے میری جان و مال اور اہل و عیال سے بڑھ کر محبوب ہیں۔ جب آپؐ کی یاد آتی ہے تو صبر نہیں کر سکتا جب تک حاضر ہو کر آپؐ کی زیارت نہ کر لوں۔ جب مجھے اپنے مرنے کی اور حضور ﷺ کے وصال کی یاد آتی ہے تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ آپؐ تو بہشت کے اعلیٰ مقام پر ہوں گے۔ اگر میں جنت میں بھیجا بھی گیا تو مجھے آپؐ کی زیارت کیسے میسر ہوگی؟ آپ ﷺ نے اُسے خوشخبری سنائی کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کا واقعہ آپ ﷺ کے غلام ثوبانؓ اور دوسرے بعض اصحابؓ سے بھی منقول ہے۔

محبت کا تقاضا ہے کہ جس چیز کو نبی مکرم ﷺ پسند کرتے ہوں' آپؐ سے پیار و محبت اور الفت رکھنے والے بھی اسے پسند کریں۔ ایک صاحب نے چھوٹی سی ڈبیہ میں کچھ سفوف رکھا ہوا تھا' جب بھی کھانا کھاتے ڈبیہ سے تھوڑا سا سفوف نکالتے اور اپنے سالن میں ڈال لیتے۔ کسی نے پوچھا یہ کیا چیز ہے جو تم اپنے سالن میں ڈال لیتے ہو؟ کہنے لگے میں نے کدو کو سکھا کر پیس کر اس ڈبیہ میں ڈال رکھا ہے اور جب بھی کھانا کھاتا ہوں تو تھوڑا سا کدو کا سفوف اپنے سالن میں ڈال لیتا ہوں' اس لیے کہ حضور ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ اور میری خواہش ہے کہ میرے ہر کھانے میں کدو شامل ہو۔

ایک صحابیؓ اپنی قمیص میں بٹن نہیں لگاتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ اپنی قمیص کو بٹن نہیں لگاتے؟ کہنے لگے جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا اُن کا گریبان کھلا تھا' تو میں بھی بٹن نہیں لگاتا اور گریبان کھلا رکھتا ہوں۔ اگرچہ گریبان کھلا رکھنا آپ ﷺ کا حکم نہیں اور کسی وقت آپؐ کا گریبان کھلا رہ گیا ہوگا' لیکن اس دیکھنے والے نے جب آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو قمیص کو بٹن نہ لگائے ——— ایک شخص کو آپ ﷺ نے دیکھا کہ سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہے۔ آپؐ نے اس کو اچھا نہ سمجھا اور اُس کی انگوٹھی پرے پھینک دی۔ محفل ختم ہوگئی اور انگوٹھی زمین پر پڑی رہی۔ ایک شخص نے انگوٹھی کے مالک سے کہا کہ انگوٹھی اٹھا کر کسی اور مصرف میں استعمال کر لو۔ اُس نے کہا کہ جس شے کو رسول اللہ ﷺ نے پھینک دیا ہو اسے میں کیسے اٹھا لوں! ——— رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے' اژدہام کی وجہ سے کچھ لوگ کھڑے تھے' آپؐ

نے فرمایا جو لوگ کھڑے ہیں وہ بھی بیٹھ جائیں۔ ایک صاحبؓ آ رہے تھے اُن کا ایک قدم مسجد کے اندر اور دوسرا باہر تھا۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کی آواز سنی تو وہیں اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ پوچھا گیا آپ دونوں پاؤں اندر کر کے بیٹھ جاتے۔ کہنے لگے کہ جب میں نے سن لیا کہ آپؐ بیٹھ جانے کا کہہ رہے ہیں تو میں اسی حالت میں بیٹھ گیا اور فوراً آپ ﷺ کے فرمان کی اطاعت کی اور قدم اندر کرنا بھی جائز نہ سمجھا۔

آپؐ کے فرمان کی یہ اہمیت ہے کہ اگر کوئی صاحب نماز پڑھنے میں مشغول ہوتے اور رسول اللہ ﷺ اُسے بلاتے تو اُس کے لیے ضروری تھا کہ وہ نماز چھوڑ کر آپؐ کو لبیک کہے۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں آواز دی' وہ جلدی جلدی نماز پڑھ کر متوجہ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: تم نے فوراً جواب نہیں دیا؟ کہنے لگے میں نماز میں مصروف تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ﴾ (الانفال:٢٤) ''اے ایمان والو! لبیک کہا کرو اللہ اور رسولؐ کی پکار پر جب وہ تمہیں پکاریں اُس شے کے لیے جو تمہارے لیے زندگی بخش ہو''۔ اس پر اُبی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ آئندہ اس حکم کی اطاعت کروں گا' اگر بحالت نماز بھی آپؐ بلائیں گے تو فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو ''غسیل الملائکہ'' کہا جاتا ہے۔ وہ جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ اگلے سال اُحد کی جنگ کے لیے آپ ﷺ نے جہاد کی ندا دی تو حنظلہ پر غسل فرض تھا۔ آپ ﷺ کی پکار سن کر وہ اسی حالت میں میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔ آپؓ نے معرکہ میں بڑی بہادری دکھائی اور وہیں شہید ہو گئے۔ اُن کو غسل دینے کے لیے فرشتوں کی ایک جماعت آئی۔ حضور ﷺ نے یہ دیکھا تو معلوم کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ تو ان کی بیوی نے بتایا کہ اُن پر غسل فرض تھا۔ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسی وجہ سے اُسے فرشتے غسل دے رہے تھے۔ چنانچہ اُن کا لقب ''غسیل الملائکہ'' پڑ گیا۔ بعد ازاں آپ کا بیٹا عبداللہ پیدا ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم یا فیصلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ آپ ﷺ کی ردّ کی ہوئی چیز ہرگز قبول نہ کرتے تھے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ وہ اس کے رزق میں برکت کے لیے دعا کریں۔ آپؐ نے اُسے صبر کی تلقین کی' مگر اس کے اصرار پر آپؐ نے دعا کر دی۔ آپؐ کی دعا مستجاب ہوئی اور اُس کے ریوڑ بڑھتے



گئے اور وہ مدینہ کے حوالی میں چلا گیا۔ حضور ﷺ نے زکوٰۃ کے محصلین کو اس کے پاس بھیجا تو اُس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ جب اُس کے پاس حضور ﷺ کی ناراضگی کی خبر پہنچی تو بادلِ نخواستہ زکوٰۃ لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے تمہاری زکوٰۃ لینے سے منع فرما دیا ہے۔ اُس نے بہت واویلا کیا مگر اس کی زکوٰۃ قبول نہ ہوئی۔ پھر آپؐ کے بعد وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس زکوٰۃ لے کر گیا مگر انہوں نے بھی زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ جس کی زکوٰۃ رسول اللہ ﷺ نے قبول نہ کی' ابوبکر کیسے قبول کر سکتا ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں زکوٰۃ پیش کی مگر انہوں نے بھی قبول نہ کی۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی زکوٰۃ قبول نہ کی۔ ہر ایک نے یہی کہا کہ جسے رسول اللہ ﷺ نے رد کر دیا ہم کس طرح اُسے قبول کر سکتے ہیں؟ بالآخر حضرت عثمانؓ کے عہد میں وہ مر گیا۔

اسلامی تعلیم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا تاکیدی حکم ہے۔ اگر والدین فوت ہو جائیں تو اُن کے عزیز و اقارب اور دوست احباب کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے جائیں۔ حضور ﷺ کے عزیز و اقارب کا درجہ تو ان سے بہت بڑا ہے' اور پھر آپؐ نے بھی اپنے اہلِ بیت اور اصحاب کی عزت و احترام کو لازمی قرار دیا ہے اور اُن کے ساتھ بغض و عناد رکھنے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے نواسے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھتا ہے اور مجھ سے محبت رکھنے والا بالیقین اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے۔ اور ان سے دشمنی رکھنے والا مجھ سے دشمنی رکھتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فاطمہؓ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے' اس کو غضب میں لانے والی چیز مجھے بھی غضب میں لاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: انصار کے ساتھ محبت رکھو' ان کے ساتھ عداوت نفاق کی علامت ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے متعلق فرمایا: جو ان سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کے باعث ان سے محبت کرتا ہے' اور جو مجھ سے دشمنی رکھے وہ اس کی بنا پر ان سے بھی دشمنی رکھتا ہے۔ جو ان کو تکلیف دیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ایذا دینے والا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو ایذا دیتا ہے قریب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور اس کے عذاب میں گرفتار ہو۔ صحابہ کرام کی جماعت نے اسلام کی خاطر اور اللہ اور رسول ﷺ کی رضا جوئی میں اپنے عزیز و اقارب' باپ' بھائیوں' بیٹوں اور دوستوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے ایک موقع پر کہا کہ اگر ہم مدینہ واپس گئے تو عزت

والے ان ذلیلوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔ اس منافق نے اپنے آپ کو عزت والا اور صحابہ کرام کو ذلیل کہا۔ جب وہ مدینہ واپس آ گئے تو اسی منافق کا فرزند عبداللہ (رضی اللہ عنہ) تلوار کھینچ کر شہر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور اپنے باپ کو کہنے لگا کہ خود اپنے آپ کو سب سے ذلیل کہو اور کہو کہ سب سے زیادہ عزت والے رسول اللہ ﷺ خود اور ان کے صحابہ ہیں' ورنہ ابھی تمہارا سر قلم کر دوں گا۔ چنانچہ اُس نے اپنی زبان سے کہا: **انا اذل الناس واصحاب محمد اعز الناس** ''میں سب لوگوں سے ذلیل اور محمد ﷺ کے اصحاب سب لوگوں سے زیادہ عزت والے ہیں''۔ اس پر عبداللہؓ نے اپنے باپ کی جان بخشی کی۔

رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کو قرآن مجید میں اہلِ ایمان کی مائیں کہا گیا ہے۔ لہٰذا اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ اُن کی عزت واحترام اپنی حقیقی ماؤں سے زیادہ کریں۔ آپ ﷺ نے ان کی نام بنام تعریف کی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ اہلِ ایمان کے لیے اُن کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں' پس اُن کی عزت وتکریم ہر دوسری چیز سے بالاتر ہے۔ صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے ساتھ ادب واحترام کی عظیم مثالیں قائم کی ہیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کہا کرتے تھے: اللہ کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا' بالیقین ابوقحافہ کی بجائے اگر ابوطالب ایمان لاتے تو میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک اور روشنی ہوتی' کیونکہ ابوطالب کا اسلام لانا آپؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو کہا کرتے کہ میرے والد خطاب مسلمان ہو جاتے پھر بھی آپ کا اسلام لانا میرے لیے زیادہ پسندیدہ ہوتا' کیونکہ آپ کے اسلام لانے کو رسول اللہ ﷺ زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کی محبت تو رسول اللہ ﷺ کی محبت کا لازمہ ہے۔ اسی طرح اصحابِ رسولؐ کی محبت بھی رسول اللہ ﷺ کی محبت کی دلیل ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کے درخشاں نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ دل وجان سے رسول اللہ ﷺ پر فدا تھے۔ اسلام کا غلبہ قائم کرنے کے لیے وہ رسول اللہ ﷺ کے دست وبازو بنے تو اللہ نے اُن کو اپنی رضا سے نوازا۔ نبی اکرم ﷺ پر درود وسلام پڑھنا اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کی محبت اور قربت کا سبب ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''قیامت کے دن مجھ سے قریب ترین اور مجھ پر زیادہ حق رکھنے والا میرا وہ امتی ہوگا جو مجھ پر زیادہ درود بھیجنے والا ہوگا۔''



رسول اللہ ﷺ کی محبت میں زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھنا ہمیشہ سے اُمت کے متقی' عبادت گزار' راتیں اللہ کی یاد میں گزارنے والے بزرگوں کا وظیفہ رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب وضو فرماتے تو آپؐ کے صحابہ وضو کا پانی لے لے کر اپنے جسموں اور چہروں پر ملنے لگتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم کو کیا چیز اس فعل پر آمادہ کرتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت۔ ان کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کی یہ خوشی ہو کہ اس کو اللہ اور رسول سے حقیقی محبت ہو یا یہ کہ اللہ اور رسول اس سے محبت کریں تو اُسے چاہیے کہ جب وہ بات کرے تو سچ بولے۔ اور جب کوئی امانت اس کے پاس رکھی جائے تو ادنیٰ خیانت کے بغیر اس کو ادا کرے۔ اور جس کے پڑوس میں اس کا رہنا ہو اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے''۔ گویا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی آپ ﷺ کی تعلیمات کو اپنائے۔ اگر یہ نہیں تو محبت کا دعویٰ ایک بے جا جسارت اور ایک طرح کا نفاق ہے۔

واضح ممنوعات اور منکرات پر جمے رہنے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی محبت کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپؐ سے محبت رکھنے والے کو آپؐ کی پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی محبت کا دعویٰ بھی کرے اور بے نماز بھی ہو' سود بھی کھائے' جھوٹ بولے اور وعدہ خلافی کرے۔ ہر انسان سے گناہ کا صدور ناگزیر ہے۔ گناہ کے بعد نیکی کرنا اور بخشش چاہنا اللہ کو خوش کرتا ہے۔ لیکن کسی گناہ کو بطور پیشہ ہمیشہ کے لیے اپنائے رکھنے کا تو ہرگز کوئی جواز نہیں۔ جھوٹ بول کر تجارت کرنا' سودی کاروبار میں لگے رہنا اور پھر حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا دعویٰ منافقت نہیں تو اور کیا ہے! ❁❁❁

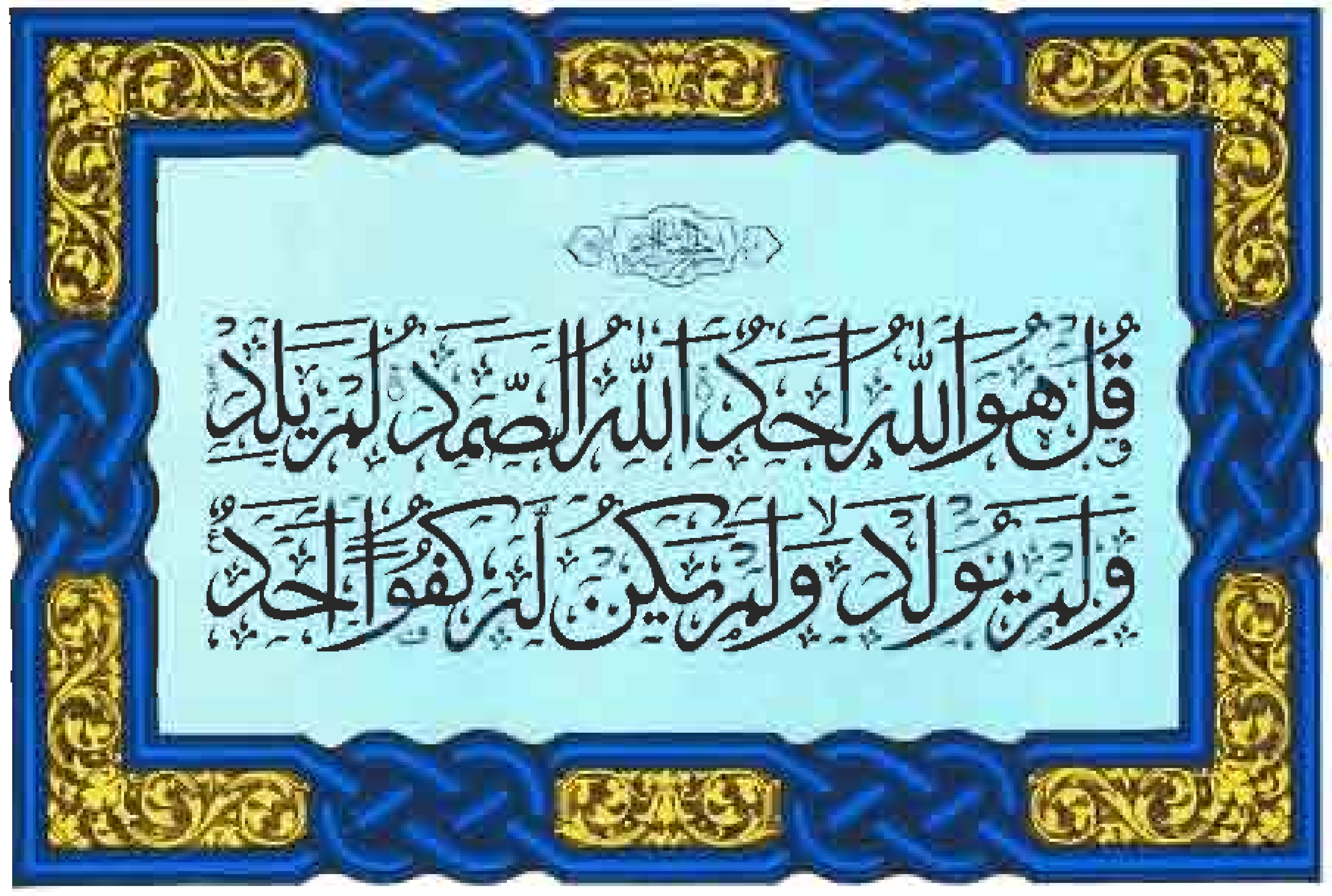

# اسلامی ریاست کا تصور، غیر مسلموں پر ظلم!

حامد کمال الدین ☆

قراردادِ مقاصد کے زیرِعنوان ...... اسلامیانِ پاکستان نے اپنے اس تاریخی عہد کو آئینی زبان میں قلمبند کیا کہ: زمین کے اِس گوشے میں پائے جانے والے جو کچھ وسائل اور اختیارات ہیں وہ اُس مالکِ کائنات کی عبادت اور ماتحتی میں دیے جاتے ہیں جس نے محمد ﷺ کو دستورِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور کرۂ ارض کے ایک ایک شخص اور ایک ایک ملک کے لیے قیامت تک آپ ﷺ کو ہادی اور مطاع ٹھہرایا ہے۔

اس قرارداد کی عبارت میں بہت سی کمیاں یا غلطیاں ہوں گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے عملاً اسلام کو کچھ نہ دیا گیا ہو اور محض یہ ایک رسمی کارروائی کا نام رہ گیا ہو۔ مگر ان سب باتوں پر گفتگو کا اور مقام ہے۔ یہاں ایک طبقہ اب ایسا سامنے آیا ہے جو اس بات کو ہی اصولاً ''خلافِ شرع'' ٹھہراتا ہے کہ اِس خطہ زمین کے ریاستی معاملات میں شرعِ محمدیؐ کو دستور ٹھہرا دیا جائے۔ اس کے خیال میں یہ یہاں رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ زیادتی ہے، خواہ مسلمان یہاں اکثریت ہی میں کیوں نہ ہوں، اور خواہ ان غیر مسلموں کے شخصی حقوق کو کتنا ہی محفوظ کیوں نہ کر دیا گیا ہو۔ ان کے نزدیک قومی ریاست کا دستور اس سے شدید متاثر ہو جاتا ہے۔ اور اس ''ظلم'' کے معاملہ میں ہمیں خدا کے آگے جوابدہ ہونے سے ڈر جانا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

> ''ہر شخص جانتا ہے کہ اِس کے لیے نہ کوئی فرمان آسمان سے نازل ہوا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کی طرح یہ صرف مسلمانوں کا ملک ہے، نہ مسلمانوں نے اِس کو فتح کر کے اِس میں رہنے والے غیر مسلموں کو اپنا محکوم بنا لیا ہے اور نہ وہ اُن کے ساتھ کسی معاہدے کے نتیجے میں اِس ریاست کے شہری بنے ہیں۔ وہ صدیوں سے اِسی سرزمین

☆ مدیر ماہنامہ 'ایقاظ' لاہور hamidateeqaz@gmail.com



> کے باشندے ہیں، جس طرح مسلمان اِس کے باشندے ہیں اور ریاست جس طرح مسلمانوں کی ہے، اُسی طرح اُن کی بھی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اِس اصول پر نہیں ہوئی تھی کہ ایک حصے کے مالک مسلمان اور دوسرے کے ہندو ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگ اُن کے محکوم بنا دیے گئے ہیں، بلکہ اِس اصول پر ہوئی تھی کہ برطانوی ہند کے جن حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُنھیں الگ ملک بنا دیا جائے گا اور ہندوستان کی ریاستوں کے حکمران آزاد ہوں گے کہ چاہیں تو اپنی آزادی برقرار رکھیں اور چاہیں تو ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی کے ساتھ الحاق کر لیں، اِس سے قطع نظر کہ اُن کی رعایا میں اکثریت مسلمانوں کی ہے یا ہندوؤں کی یا کسی دوسرے مذہبی فرقے کی۔ اِس طرح کی ریاست کو اگر اکثریت کے زور پر مسلمان یا مسیحی یا ہندو بنانے کی کوشش کی جائے گی تو یہ محض تحکم اور استبداد ہوگا، جس کی تائید کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کو اُس کے پروردگار نے حکم دیا ہو کہ وہ ہر حال میں قائم بالقسط رہے گا اور حق کی گواہی دے گا، اگرچہ یہ گواہی اُس کے اپنوں کے خلاف ہی پڑ رہی ہو۔ ریاست پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے حق میں یہ گواہی اب ضروری ہے کہ تاریخ کے صفحات پر ثبت کر دی جائے۔''

(''ریاست اور حکومت'' از جاوید احمد غامدی۔ روزنامہ جنگ ۲۲ فروری ۲۰۱۵ء)

## قراردادِ مقاصد میں کس کا حق غصب ہوا؟

ہمارا جواب ان حضرات کے لیے یہ ہے:

اس سے پہلے کہ آپ ایک ''غصب'' کا سوال اٹھائیں، آپ کو وہ ''حق'' ثابت کر لینا چاہیے جسے کسی ہندو یا عیسائی یا سکھ کو نہ دے کر آپ کے خیال میں ہم ظلم کر بیٹھے۔ ریاستی عمل میں محمد ﷺ پر ایمان نہ رکھنے والے ایک شخص کو برابر کا حصہ دار نہ رکھنا اُس کے جس حق کا غصب ہے اور وہ حق جہاں سے واجب ہوا، اس کا تعین پہلے ضروری ہے۔

دورِ حاضر میں جس چیز کو آپ ریاست کہتے ہیں وہ بنیادی طور پر زمین کے وسائل اور اختیارات میں تصرف کرنے کا نام ہے۔ یعنی یہ آپ اپنی ذات میں ایک جبر ہے۔ بیشک یہ ایک ناگزیر جبر ہے، عمرانی ضرورت ہے، مگر انسانی اموال وارواح میں یہ تصرف کسی دلیل کا بھی محتاج ہے۔ بغیر دلیل یہ دھونس اور ظلم ہوگا، اور دلیل ہو تو یہی جبر عدل کہلائے گا۔ ہمارے اسلامی تصور میں: انسانی اموال و ارواح کے لیے قانون اور ضابطے بنانے کا 'حق' رکھنا

درحقیقت ایک انسان کو خدا بنا دیتا ہے‘ خواہ یہ ’’انسان‘‘ فرد ہو یا جماعت۔ ہاں وہ اپنی ذاتی اشیاء میں جیسے مرضی تصرف کرے‘ کوئی اسے اس حق سے محروم کرنے والا نہیں۔ مگر خدا کے بندوں کے لیے ہی وہ حق اور ناحق کے پیمانے صادر کرنے لگے‘ ان کے باہمی حقوق و فرائض کا تعین خاص اپنی نظر اور صوابدید سے کرے‘ خدا کے بندوں کے لیے زمین پر رہنے کے قانون اور ضابطے بنائے اور ان کے لیے سزائیں تجویز کرے‘...... یہ اگر کسی کا حق ہے تو اس پر ہمارے ان بھائیوں کو دلیل لانا ہوگی۔ آخر کہیں تو آیا ہوگا کہ خدا نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو کسی پر یہ حق دے رکھا ہوا ہے! یہ ’’جبر‘‘ اپنے حق ہونے کے لیے لامحالہ کسی سند کا محتاج رہے گا۔ اگر تو یہ خدا کے وضع کردہ دائرہ کا پابند ہے‘ (جو کہ اُس کی شریعت سے ہی معلوم ہوسکتا ہے) تو اس کے آگے ہمارا سر یقیناً خم ہے۔ ورنہ یہ پوچھنے کا حق ہمیں ہے کہ انسانی زندگیوں میں تصرف کرنے کا حق تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے؟[1]

پس ’’ریاست‘‘ کے نام سے ایک چیز پر ہمارے ماڈرنسٹ جب ہمیں کسی کا ’حق‘ جتاتے ہیں‘ یہاں تک کہ اس کا یہ ’حق‘ نہ دینے پر ہمیں ظلم کا موردِ الزام ٹھہراتے ہیں...... اس کا یہ حق ثابت کرنے پر ان حضرات کے پاس دلیل کیا ہوتی ہے؟ بلکہ انسانی زندگیوں میں تصرف کا یہ ’حق‘ روئے زمین کے کسی بھی انسان کے لیے ثابت کہاں سے ہوتا ہے؟

کافر یا مسلمان کا زمین پر ’’فرد‘‘ کے طور پر جو حق ہے وہ تو ہمیں معلوم ہے‘ شریعت سے ثابت ہے۔ اس معنیٰ میں کہ وہ زمین کے اتنے مرلے یا اتنے بیگھے یا اتنے مربعے کا ’مالک‘ ہے۔ اُس کا یہ حق اگر کسی نے چھینا ہے تو صاف ظلم کیا ہے۔ کافر بھی ہو تو وہ قطعہ زمین اور اس میں جو کچھ ہے اس کی شرعی ملکیت ہے...... اور بطورِ ’’فرد‘‘ وہ اس میں تصرف کا پورا حق رکھتا ہے۔ البتہ یہ بات کہ بطورِ جماعت (as a collective entity) وہ زمین کے ’’وسائل اور اختیارات‘‘ کا بھی مالک ہے‘ اس کی کیا دلیل ہے آپ کے پاس؟

زمین کے یہ ’’وسائل اور اختیارات‘‘ بھی دنیا کے اندر کسی ’ملکیت‘ کا نام ہوگیا ہے‘ اور اس پر لوگوں کا ہندو یا عیسائی یا سکھ کے طور پر ’حق‘ بھی ہوگیا ہے‘ اس بات کی سند خدا نے کہاں اتاری ہے؟

(۱) ریاست اور اس کے ناگزیر جبر کے حوالے سے ’ایقاظ‘ مارچ کے شمارہ میں چند مقالات شامل ہیں‘ تفصیل کے لیے وہیں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ اس مسئلہ پر زیادہ تفصیلی روشنی ہم نے اپنی زیرِ تالیف ابن تیمیہ کی خلافت و ملوکیت پر تعلیقات میں ڈالی ہے۔



’ریاست‘ تو‘ جیسا کہ ہم نے عرض کیا‘ زمین کے وسائل اور اختیارات کے اندر تصرف ہے‘ نہ کہ ’فرد‘ کے طور پر زمین کے کچھ بیگھوں یا کچھ مربعوں کا مالک ہونا۔ حیرت کی بات ہے یہاں آپ کو ’فرد‘ بھول جاتا ہے اور ’ایک اجتماعی ہستی‘ (collective entity) کے طور پر آپ اُس کو وہ حق دے ڈالتے ہیں۔ آخر کس دلیل سے؟ اقول ما قال الناس!؟ (اسی وجہ سے کہا گیا کہ اکثر عقول کے لیے اپنے دور کے دیے ہوئے سانچوں سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا‘ اس کے لیے آدمی کو بہت زیادہ ٹھیٹ ذہن ہونا پڑتا ہے‘ جس کو یہاں کا ارتقائی جدت پسند ’جمود‘ کا نام دے گا۔ یہ وجہ ہے کہ کئی ایک اہل علم نے دورِ غلامی کے ’اجتہادات‘ سے خدا کی پناہ مانگی ہے)۔

یہاں‘...... ایک ایک مذہب کی ’اجتماعی حیثیت‘ زمینی اختیارات کے مالک کے طور پر کہاں سے آ گئی؟ اس کی تو کوئی دلیل نہیں دی گئی‘ اور نہ دی جاسکتی ہے۔ البتہ زمین کے ان وسائل اور اختیارات کو شرعِ آسمانی (آئینِ محمدیؐ) کا پابند ٹھہرا دینے والوں کے خلاف ’’ظلم ظلم‘‘ کا شور بے پناہ الاپ دیا گیا! اور یہ ’’ظلم‘‘ ہو جانے پر ’’كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ‘‘ کے حوالے۔ قربان جائیں اس پرہیزگاری پر! پہلے وہ ’حق‘ بھی تو ثابت کرلیں جو ’چھین‘ لیا گیا ہے!

زمین کے وسائل اور اختیارات پر ’حق‘ کسی کا نہیں ہے برادرم! نہ مسلمان کا نہ کافر کا۔ نہ اقلیت کا نہ اکثریت کا‘ نہ جمہور کا نہ غیر جمہور کا۔ کوئی اگر کہتا ہے کہ یہ فلاں کا حق ہے تو وہ اس بات کی دلیل دے۔ خدا کی زمین پر اِس اجتماعی جبر اور تصرف کا حق خدا کی جانب سے اتاری ہوئی سند سے ہی ملے گا‘ آپ وہ دکھائیں تو بات ہے۔ ہاں ’’فرد‘‘ کے طور پر کچھ بیگھے زمین کا مالک بننا ہر کسی کا حق ہے‘ خواہ وہ کافر ہے یا مسلمان‘ جس میں اپنے درست یا غلط تصرف کا حساب اُسے خدا کے ہاں جا کر دینا ہے‘ ہمیں نہیں۔ ہم ایسے ہر (فردی) حق کا احترام کرتے ہیں اور اس کی پاسبانی کو اپنا اجتماعی فریضہ جانتے ہیں۔ البتہ ’’جماعت‘‘ کے طور پر اُس کا زمین کے اختیارات اور وسائل کا مالک ہونے کی دلیل چاہیے‘ اور یہی پوائنٹ ہمارے اور آپ کے مابین موضعِ نزاع ہے:

زمین کے وسائل اور اختیارات پر تصرف کا کسی کو بطور ہندو یا بطور عیسائی یا بطور سکھ حق ہونا؟ حتیٰ کہ کسی بھی حیثیت میں کوئی اس کا مالک ہو‘ اس کی دلیل؟

’’غصب‘‘ کا سوال ظاہر ہے ’’مالک‘‘ کا تعین ہونے کے بعد آئے گا۔

آپ کو معلوم ہے ’’ریاست‘‘ کے زیرِ عنوان ’’زمین کے یہ اختیارات‘‘ انسانی اموال‘

دِماء اور فروج تک میں ''تصرف'' ہے[1]۔ حتیٰ کہ اپنی قلمرو میں (بذریعہ تعلیم و ابلاغ) انسانی عقول کی ساخت کرنے اور کائنات کی بنیادی ترین حقیقتوں کو ایک خاص نظر سے دکھانے کا 'حق' رکھنا سٹیٹ کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے۔ یعنی عقول تک کسی کی 'جاگیر' ہو جاتی ہیں۔ ماڈرن سٹیٹ اس کو given کے طور پر لیتی ہے۔ روسو نے اِس 'اختیار' کی دلیل دینے کی ایسی ایسی بھونڈی کوشش کی ہے کہ آدمی کو اس خرد پر تعجب ہونے لگتا ہے جو انسان کو خدائی کے منصب پر بٹھانے کے لیے 'درکار' ہے۔ ''زمین کا مالک و متصرف'' ہونے کے اس دعویٰ پر کوئی روسو کا ہم خیال ہے تو بھی ہم مسلمانوں کو اس کا پابند کرنے کے لیے اُس کو خدا کی جانب سے اتاری گئی کوئی سند ہی لا کر دینا پڑے گی۔ صاف بات ہے' زمین کے یہ وسائل اور اختیارات کسی کے نہیں ہیں' یہ خدا کی چیز ہے۔ خدا نے کسی کو تفویض نہیں کر دی ہوئی ہے۔ یہ چیز جس کا مالک یہاں کا کوئی انسان نہیں ہے...... اِس کو تو خدا کے نام اور خدا کی مرضی (شریعت) کے بغیر ہاتھ لگانا بھی ہمارے نزدیک ظلم ہے (کیونکہ یہ انسانوں پر جبر سے عبارت ہے' جو خدا کی اجازت کے بغیر نہ اکثریت کو روا ہے اور نہ اقلیت کو)۔ ہاں خدا کے نام اور خدا کی مرضی سے ان وسائل اور اختیارات کو اہلِ زمین کی دنیوی و اخروی منفعت کا ذریعہ بنانا خدا کی عبادت کی ایک صورت ہے' اور مسلمان خدا کی آخری اور اِس وقت کی واحد آسمانی شریعت کا امین ہونے کے حوالے سے' اور محض اِس حیثیت میں— حسبِ قدرت— اس عبادت کا مکلّف۔ پس اس چیز کا ''عبادت'' اور ''امانت'' (ذمہ داری) ہونا تو یقیناً ہمیں سمجھ آتا ہے۔ 'حق' البتہ یہ کسی کا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو کسی سے 'چھیننے' کا کیا سوال؟

قراردادِ مقاصد کی یہ شق کم از کم اس جہت سے نہایت موزوں ہے: ''یہ خدا کی امانت ہے اور اپنے استعمال کے معاملہ میں خدا کے بخشے ہوئے اختیارات کی پابند''۔ ('خدا کے بخشے ہوئے اختیارات' کی بجائے 'خدا کے نازل کردہ احکام' کا لفظ گو ہماری نظر میں مناسب تر تھا)۔

(۱) دماء میں تصرف: مثال: ریاست جرم کا تعین کرے گی اور ریاست ہی اس پر سزا دے گی' جس میں اُس انسان کی جان لے لینا بھی آتا ہے۔

فروج میں تصرف: مثال: ریاست ہم جنس شادی کو جائز ٹھہرا سکتی ہے۔ دو شادیوں کی ممانعت اور اس پر سزا دے سکتی ہے۔ ایک شرعاً بالغ شخص پر نکاح ممنوع ٹھہرا سکتی اور اس پر سزا دے سکتی ہے۔ وغیرہ

ہمارے ان بھائیوں کو ثابت کرنا ہے کہ خدا نے کسی مخلوق کو یہ حق کہاں دیا ہے؟



بیسویں صدی کے عالمی بُت کدہ میں توحید کی ایک ایسی خوبصورت آواز! خدا کروٹ کروٹ آرام دے ان نفوس کو جنہوں نے خدا کی زمین کے ایک بقعے کے ماتھے پر بڑی محنت اور جدوجہد سے یہ تحریر درج کر ڈالی' اور ان کی کوتاہیاں معاف فرمائے۔ اور خدا ہدایت دے ان نفوس کو جو اس تحریر کو کھرچنے کے لیے زور لگا رہے ہیں۔

زمین کے یہ سب وسائل اور اختیارات کسی انسان کی جاگیر نہ رہیں' نہ مسلمان نہ ہندو کوئی ان اختیارات کا مالک نہ ہو...... ایسی عدل کی بات پر بتائیے کسی کو کیا اعتراض ہے؟

*****

یہاں سے' بارِ ثبوت (burden of proof) فریقِ مخالف پر ہو گیا ہے: خدا نے انسانی زندگیوں میں تصرف کا حق کسی انسان کو کہاں دیا ہے؟ کوئی دلیل ہو تو پیش کیجیے۔

*****

اِس نقطہ نظر کے اصحاب یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ مدینہ کی جس مثال سے آپ لوگ دلیل پکڑتے ہیں وہاں تو رسول اللہ ﷺ کو حاکم بنانے والا خود ربّ العالمین ہے۔ آپ کی حاکمانہ حیثیت یہاں کس چیز سے ثابت ہوئی؟ ہم کہتے ہیں' یہاں کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔ حکمران کے اختیار کا کیا طریقہ ہے' یہ سوال یہاں پر غیر متعلقہ ہے' گو فقہاء نے بڑی وضاحت سے یہ بات کر رکھی ہے کہ امت اپنا حکمران چننے کی واحد مجاز ہستی ہے۔ یہاں مسئلہ زیر بحث البتہ اس سے کہیں بڑا ہے:

رسول اللہ ﷺ کو ''حکمران'' کے طور پر آسمان سے جو سند حاصل ہوئی وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ البتہ اسلام کو انسانی معاشروں کے لیے دستور ٹھہرائے جانے کی جو سند آسمان سے ملی وہ اسلام کے ساتھ خاص ہے۔ وہ اپنی جگہ ایک حقیقت' یہ اپنی جگہ۔ ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے سے خلط نہ کرنا چاہیے۔


جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

# امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرشید عراقی

امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تبع تابعین کے اُس گروہ سے تھا جو اپنے علم وفضل، زہد وورع، تقویٰ وطہارت، حفظ وضبط، امانت ودیانت، عدالت وثقاہت اور پرہیزگاری میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی زندگی دینی جذبہ سے معمور تھی۔ فیاضی اور سخاوت ان کی زندگی کے جلی عنوانات ہیں۔

امام عبداللہ بن مبارکؒ کے والد مبارک ایک شخص کے غلام تھے جو اپنے آقا کے بڑے مطیع، فرمانبردار اور متقی وپرہیزگار تھے اور اپنے مالک کے باغ میں چوکیداری کرتے تھے۔ ایک دن باغ کے مالک نے مبارک سے کہا کہ باغ سے ایک تُرش انار توڑ کر لاؤ تو مبارک شیریں انار توڑ کر لے گئے۔ مالک نے دوبارہ ان سے شیریں انار لانے کو کہا تو وہ ترش انار توڑ کر لے گئے۔ آقا نے مبارک سے کہا: ''عجیب آدمی ہو تمہیں اس باغ میں کام کرتے کافی عرصہ ہوگیا ہے، مگر تمہیں شیریں اور ترش انار کی تمیز نہیں ہے!'' مبارک نے جواب دیا کہ ''آپ نے مجھے باغ کی چوکیداری کے لیے رکھا ہوا ہے اور میں باغ کی چوکیداری کرتا ہوں۔ انار کھانے کی آپ نے اجازت نہیں دی ہوئی ہے، اس لیے میں نے کبھی بھی انار نہیں کھایا۔ اس لیے مجھے کیسے تمیز ہوسکتی ہے کہ شیریں انار کون سا ہے اور ترش انار کون سا ہے!'' باغ کا مالک مبارک کے منہ سے یہ بات سن کر بہت متعجب ہوا اور ان کی دیانت داری اور حق شناسی کا اس پر بہت اثر ہوا اور وہ ان کی بہت قدر ومنزلت کرنے لگا۔

مبارک کے آقا کی ایک جوان لڑکی تھی اور وہ اس کی شادی کی فکر میں تھا۔ لڑکی بہت خوبصورت اور نیک سیرت وپاک خصلت تھی۔ شادی کے پیغامات ہر طرف سے آرہے تھے، لیکن لڑکی کا والد کوئی فیصلہ نہیں کر پارہا تھا۔ ایک دن اس نے مبارک سے کہا کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے تو میں اس کی شادی کہاں اور کس سے کروں؟ مبارک نے جواب دیا: ''عہد جاہلیت میں لوگ حسب ونسب تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کو داماد بنانے کے لیے مالدار



شخص کی جستجو ہوتی تھی۔ عیسائی جمال کو اہمیت دیتے تھے، لیکن اُمت محمدیہؐ کے نزدیک دین، تقویٰ اور پرہیزگاری کو معیار سمجھا جاتا ہے۔ آپ جس چیز کو چاہیں ترجیح دیں''۔ مالک نے آکر اپنی بیوی کو تمام تفصیل بتائی اور اس کے ساتھ کہا کہ میری لڑکی کا شوہر بننے کے لیے مبارک سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ مبارک کے آقا کی بیوی بھی بڑی نیک سیرت تھی۔ انہوں نے اپنے خاوند کی تجویز سے اتفاق کیا اور اپنی لڑکی کی شادی مبارک سے کردی۔ (۱)

## ولادت

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اس نیک بخت لڑکی کے بطن سے ۱۱۸ھ میں ''مرو'' میں پیدا ہوئے اور اس مرو کی نسبت سے مروزی کہلاتے ہیں۔ امام عبداللہ بن مبارکؒ کی کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی۔

## تعلیم

ان کی ابتدائی تعلیم کے متعلق مؤرخین نے کچھ نہیں لکھا کہ کہاں حاصل کی، تاہم ان کے تعلیمی اسفار کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے امام عبداللہ بن مبارک نے شام، حجاز، یمن، مصر، کوفہ اور بصرہ وغیرہ کا سفر کیا اور ہر جگہ اساطین علم وفن سے اکتسابِ فیض کیا۔ (۲)

## اساتذہ

امام عبداللہ بن مبارکؒ کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے اساتذہ میں ممتاز تابعین شامل ہیں، مثلاً: امام مالک بن انس، امام حمید الطویل، سلیمان تیمی، ہشام بن عروہ رحمہم اللہ اور تبع تابعین میں امام سفیان بن عیینہ، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد اور حماد بن سلمہ رحمہم اللہ وغیرہ۔ (۳)

## مسندِ درس

امام عبداللہ بن مبارکؒ نے ایک جگہ جم کر درس وتدریس کا سلسلہ قائم نہیں کیا۔ ان کی زندگی مجاہدانہ تھی۔ سفر بہت زیادہ کرتے تھے۔ اس لیے جس جگہ تشریف لے جاتے وہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیتے۔

## تلامذہ

ان کی مجلس درس کسی خاص جگہ قائم نہیں تھی، مگر ایک خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

**حدث عنه خلق لا یحصون من اھل الاقالیم** (۴)

”ممالک اسلامیہ کے اتنے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔“

## علم حدیث سے شغف

تمام دینی علوم میں ان کو مکمل دسترس تھی‘ مگر علم حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا۔ فرائض کی ادائیگی کے بعد حدیث کے مطالعہ میں منہمک ہو جاتے۔ حافظ ذہبیؒ نے ”تذکرۃ الحفاظ“ میں لکھا ہے کہ ایک دن سردی کے موسم میں امام ابن مبارک عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے اور علی بن حسن سے ایک حدیث کے متعلق گفتگو شروع کی تو ساری رات حدیث کے متعلق گفتگو میں گزر گئی اور مسجد سے فجر کی اذان شروع ہوگئی۔ گھر میں تمام وقت مطالعہ حدیث میں گزارتے۔ حدیث نبوی ﷺ سے ان کو بہت ہی زیادہ شغف تھا۔

## علم حدیث میں مرتبہ

علم حدیث میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ حدیث کے متعلق تمام علوم میں ان کی حیثیت نادرِ روزگار کی تھی۔ محدثین اور اربابِ سیر نے علم حدیث میں ان کے علمی تبحر اور جامع الکمالات ہونے کا اعتراف کیا ہے اور ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کے لقب سے یاد کیا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

”محدثین میں اگر کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہو جاتا تو عبداللہ بن مبارک کی طرف رجوع کیا جاتا اور فرماتے کہ اس اختلاف کو طبیبِ حدیث (عبداللہ بن مبارک) کے پاس لے چلو۔ وہ اس اختلاف کو رفع کریں گے“۔ (۵)

## دوسرے علوم

حدیث کے علاوہ دوسرے علوم دینیہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

**جمع علم الفقة والادب والنّحو واللغة والشعر والعربية والفصاحية** (۶)

”وہ علم فقہ‘ ادب‘ نحو‘ لغت‘ شعر‘ عربی ادب اور فصاحت میں جامع تھے۔“

## اخلاق وعادات

امام عبداللہ بن مبارک عادات واخلاق کے اعتبار سے علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ عبادت



وریاضت اور زہد وورع میں بلند مرتبہ ومقام کے حامل تھے۔ دوسرے الفاظ میں ضرب المثل تھے۔ خشیت الٰہی سے ہر وقت لرزاں وترساں رہتے تھے۔ ذمہ داری کا بہت احساس تھا۔ ایک بار شام میں کسی شخص سے قلم مستعار لیا اور اس شخص کو قلم واپس کرنا بھول گئے اور اپنے وطن مرو واپس آ گئے۔ مرو آ کر دیکھا کہ قلم واپس نہیں کیا تو پھر مرو سے واپس شام آئے اور اس شخص کو قلم واپس کیا۔ (۷)

سخاوت اور فیاضی کے وصف سے بہت زیادہ متصف تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کی سخاوت اور فیاضی کے متعدد واقعات اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں۔ جس طرح آپ حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرتے تھے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ علماء اور طلبہ کی بھی بہت زیادہ مدد کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے ایک آدمی کے استفسار پر فرمایا:

”میں جن علماء وطلبہ پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے اربابِ فضل و صدق ہیں۔ ان لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا اور اس میں پوری محنت وسعی سے کام لیا۔ لیکن ان کی ضرورتیں بھی وہی ہیں جو عام لوگوں کی ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر ہم ان کو چھوڑ دیں تو یہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ جائیں گے اور علم ضائع ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے ان کو غنی کر دیا تو یہ آنحضرت ﷺ کی امت میں علم کی اشاعت کریں گے اور نبوت کے بعد میرے نزدیک اشاعت علم سے افضل کوئی چیز نہیں ہے“۔ (۸)

اس علم وفضل‘ زہد وتقویٰ‘ فیاضی اور سخاوت کے باوجود طبیعت میں بہت زیادہ تواضع و انکساری تھی۔ علم وحلم کا مرقع تھے اور تقویٰ وطہارت کا پیکر تھے۔

## حق گوئی

حق گوئی میں ضرب المثل تھے۔ اُمراء وسلاطین سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے کئی بار ملنے کی خواہش کی مگر بہت کم ملتے تھے اور جب کبھی ملاقات ہو جاتی تو اعلائے کلمۃ الحق کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔

## شوقِ جہاد

امام عبداللہ بن مبارکؒ صرف صاحبِ علم وفضل ہی نہیں تھے بلکہ فنِ سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ دعوت وتبلیغ‘ اقامتِ دین کی جدوجہد‘ اصلاحِ حال اور جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے بارے میں یہ ضرب المثل مشہور تھی: فـی

اللیل رھبان وفی النھار فرسان ''رات میں وہ یکسو ہو کر عبادت میں لگے رہتے ہیں اور دن کو میدان میں شہسوار نظر آتے ہیں۔''

جہاد کا بہت زیادہ شوق تھا۔ انہوں نے سال کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ تجارت کرتے تھے' دوسرے حصے میں درس وتدریس کا کام کرتے تھے اور تیسرے حصے میں جہاد وقتال اور سفرِ حج میں مشغول رہتے تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ امام عبداللہ بن مبارک نے دینی فرائض کے ساتھ ساتھ فریضۂ جہاد کو بھی اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا۔

## ذریعہ معاش

امام عبداللہ بن مبارکؒ کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور ان کا تجارتی کاروبار بہت زیادہ وسیع تھا۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ان کی وسیع تجارت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک لاکھ درہم سالانہ فقراء ومساکین پر خرچ کرتے تھے۔(۹)

## مرجع خلائق

امام عبداللہ بن مبارکؒ اپنے علم وفضل اور محاسن اخلاق کی وجہ سے مرجع خلائق بن گئے تھے۔ جس جگہ بھی تشریف لے جاتے تھے لوگ جوق در جوق ان کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے اور ان کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض ہوتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ابن مبارک رقہ تشریف لے گئے (رقہ خلفائے عباسیہ کا گرمیوں کا دارالخلافہ تھا) خلیفہ ہارون الرشید کی ایک لونڈی صبح کے وقت محل پر کھڑی تھی' اس نے دیکھا کہ رقہ کے لوگ شہر سے باہر کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ اس نے جب یہ تماشا دیکھا تو بڑی حیران ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ شہر سے باہر کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک بہت بڑے عالم امام عبداللہ بن مبارک تشریف لا رہے ہیں اور یہ سب لوگ ان کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔ اس لونڈی نے بے ساختہ کہا:

**هو الملك لا ملك هارون الذى لا يجتمع الناس عليه الا بشرو ط واعوان** (۱۰)

''حقیقت میں بادشاہِ وقت تو یہ ہیں ہارون نہیں' اس لیے کہ اس کے گرد کوئی مجمع بغیر پولیس' فوج اور اعوان وانصار کے اکٹھا نہیں ہوتا۔''



## تصانیف

حافظ ذہبی نے ان کی ایک کتاب ''کتاب الذھب'' کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے: **صاحب التصانیف النافعة** ''بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں''۔(۱۱)

لیکن ابن ندیم نے آپ کی درج ذیل کتابوں کا تذکرہ کیا ہے: (۱) کتاب السنن' (۲) کتاب التفسیر (۳) کتاب التاریخ (۴) کتاب الزھد (۵) کتاب البر والصلة (۱۲)

## وفات

وفات اس قدر اچھی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو نصیب کرے۔ کسی غزوہ میں گئے ہوئے تھے کہ واپسی پر راستہ میں بیمار ہو گئے اور ۱۳/رمضان ۱۸۱ھ کو ۶۳ سال کی عمر میں صبح کے وقت بمقام ہیت انتقال کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ خلیفہ ہارون الرشید کو جب آپ کے انتقال کی خبر پہنچی تو کہا: ''علماء کے سردار کا انتقال ہو گیا۔''

حضرت سفیان بن عیینہؒ کو جب آپ کی وفات کی اطلاع ملی تو فرمایا: ''ابن مبارک بڑے فقیہ' عالم' عابد' زاہد' شیخ' بہادر اور شاعر تھے''۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ کو جب پتا چلا کہ ابن مبارک انتقال کر گئے ہیں تو فرمایا: ''ابن مبارک چل بسے' لیکن انہوں نے اپنا مثل کوئی نہیں چھوڑا۔''(۱۳)

## حواشی

(۱) تاریخ ابن خلکان' ج ا' ص ۲۴۸۔ (۲) تہذیب الاسماء' ج ا' ص ۲۸۶۔
(۳) تاریخ بغداد' ج ۱۰' ص ۱۵۴۔ (۴) تذکرۃ الحفاظ' ج ا' ص ۲۵۰۔
(۵) تہذیب التہذیب' ج ۵' ص ۳۸۵۔ (۶) تہذیب الاسماء' ج ا' ص ۲۸۵۔
(۷) تہذیب التہذیب' ج ۵' ص ۳۸۵۔ (۸) تاریخ بغداد' ج ۱۰' ص ۱۶۰۔
(۹) تاریخ بغداد' ج ۱۰' ص ۱۵۸۔ (۱۰) تبع تابعین' ج ا' ص ۲۹۲۔
(۱۱) تذکرۃ الحفاظ' ج ا' ص ۲۵۰۔ (۱۲) ابن ندیم' ص ۲۱۹/ تبع تابعین' ج ا' ص ۲۹۶۔
(۱۳) تاریخ بغداد' ج ۱۰' ص ۱۶۸۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

## پاکستانی معاشرے میں ناگوار سمجھے جانے والے دو جائز کام

# ② لڑکی کا علیحدہ گھر کا مطالبہ

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

جس طرح پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے مرد کی دوسری شادی من جانب اللہ جائز ہونے کے باوجود پاکستانی معاشرے میں انتہائی ناگوار سمجھی جاتی ہے' بالکل اسی طرح ہمارے معاشرے میں لڑکی کا الگ گھر کا مطالبہ کرنا بھی نہ صرف یہ کہ ناگوار سمجھا جاتا ہے' حتیٰ کہ اسے گناہِ کبیرہ تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہم میں سے اکثر و بیشتر مسلمان دینی گھرانوں اور عام مذہبی گھرانوں کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام میں مشترکہ رہائش کا نظام (joint family system) نہیں ہے اور بیوی کے دوسرے حقوق کی طرح علیحدہ گھر بھی اس کا حق ہے جس کی ادائیگی ضروری ہے۔ بیوی کی طرف سے مانگنے پر تو یہ حق ادا کرنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے (اور لڑکی پر اس کا کوئی الزام بھی نہیں ہے) اِلا یہ کہ لڑکی خود باقی حقوق کی طرح یہ حق بھی معاف کر دے۔

یہ بات درست ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ اس عرب معاشرے میں تشریف لائے جہاں دوسری شادی تو کیا کئی کئی شادیوں کا رواج تھا۔ اس معاشرے میں جو غلط رسم و رواج تھے وہ نبی اکرم ﷺ نے سب ختم کر دیے۔ چنانچہ کئی شادیوں کی جگہ ایک وقت میں چار بیویوں کی حد لگا دی' لیکن عرب معاشرہ میں یہ بھی رواج تھا کہ دوسری شادی کے موقع پر لڑکا اپنا گھر خود بناتا تھا اور شادی کے بعد لڑکی کو الگ گھر میں لے کر آتا تھا' اس رواج کو نبی اکرم ﷺ نے ختم نہیں کیا' بلکہ برقرار رکھا۔ ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں جہاں یہ دونوں کام —— مرد کی دوسری شادی اور لڑکی کا علیحدہ گھر کا مطالبہ —— نہ صرف یہ کہ بہت معیوب ہیں بلکہ ہمارے فرسودہ تصورات کے مطابق ان دونوں چیزوں کی قباحت حرام تک جا پہنچتی ہے۔ بہت افسوس کا مقام ہے کہ یہاں کی رسومات' بدعات' کلچر' تمدن اور ثقافت میں اسلام کے سوا ہر مذہب کے رسم و رواج موجود ہیں۔

**نوٹ**: اس مضمون کا پہلا حصہ بعنوان ''مرد کی دوسری شادی'' میثاق کے شمارہ فروری ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔



## حق بات کرنے اور اس پر عمل کرنے سے قطعاً نہ گھبرائیں

اللہ کے فضل و کرم سے محترم والد صاحب (بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ) نے آج سے چالیس سال قبل معاشرے میں پائی جانے والی شرعاً غلط رسومات کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ابتدا میں انہیں خاندان کے اندر اور باہر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا' لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آنا شروع ہوئی کہ ان فضول رسموں اور بے جا اخراجات سے نجات میں کس قدر امن' سکون اور برکتیں پوشیدہ ہیں۔ مشترکہ طرزِ رہائش کا معاملہ تو رسومات سے بہت آگے بڑھ کر معاشرتی اور خاندانی بدنظمی اور شدید بگاڑ کا سبب بن رہا ہے۔ من جانب اللہ حقوق و فرائض میں عدم توازن اور خود ساختہ حقوق و فرائض کے فتنے نے ایک فردِ واحد سے لے کر پورے معاشرے میں فساد فی الارض والی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ اور بر سبیل تذکرہ معاشرتی' معاشی اور سیاسی سطح پر: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ٤١) ''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے'' کا ہم منہ بولتا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ہم سب کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ حق کو بیان کرنے اور اس پر عمل کرنے میں انصاف اور بالکل غیر جانبداری سے کام لیں۔ پھر اس حوالے سے بے خوف اور تیار رہیں کہ اس فرسودہ نظام کو اکھاڑنے کے لیے پہلی اینٹ بہت مشکل ہوتی ہے' اس لیے کہ دنیا والے حق بات سننا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ لیکن اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمارے دینی علم اور ہمارے اعمال کی کڑی نگرانی کر رہا ہے۔ اگر ہم نے جانتے بوجھتے چند مصلحتوں اور اپنے مفادات کے پیش نظر اس دنیا میں حق کو چھپانے کی کوشش کی تو یہ ظلم کے مترادف ہوگا۔ اس ضمن میں یہ آیت یاد رہنی چاہیے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿٤٧﴾﴾

''اور ہم قیامت کے دن عدل و انصاف کی میزانیں لا کر رکھ دیں گے' پھر کسی جان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اگر ہو گا کوئی (عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی تو اسے ہم لے آئیں گے۔ اور حساب لینے کے لیے ہم کافی ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں سوا لاکھ کے مجمع میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اُس کا اکثر حصہ انسانی مساوات کی تلقین پر تھا کہ ''کسی گورے کو کسی کالے پر' کسی کالے کو کسی گورے پر' کسی

عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے‘ سوائے تقویٰ کے‘‘۔ اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ’’لوگو! غلاموں اور عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا‘ اس لیے کہ وہ تمہارے محکوم ہیں‘‘۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق ؓ کے مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد جو خطابات منظر عام پر آئے ہیں وہ تاقیامت ہمارے لیے درخشندہ مثال اور تابناک ماضی کی یاد دلاتے رہیں گے۔ (بس یاد ہی کریں گے‘ عمل تو ہم نے کرنا نہیں!) ان میں یہ الفاظ تو خاص طور پر ہم سب بااختیار لوگوں (چاہے ماں ہو‘ باپ ہو‘ استاد ہو‘ امیر ہو یا حاکم ہو) کے لیے قابل تقلید ہے کہ تمہارا سب سے زیادہ طاقتور شخص میرے نزدیک اس وقت تک کمزور رہے گا جب تک کہ میں اس سے وہ حق نہ لے لوں جو اس نے کسی کا چھینا ہے‘ اور تمہارا سب سے زیادہ کمزور شخص میرے نزدیک اس وقت تک قوی ہے جب تک کہ میں اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں۔ اسی طرح یہ بھی کہ جہاں میں غلط ہوں وہاں مجھے ٹوک دینا‘ وغیرہ۔

## ساس بہو کی جنگ‘ آخر کب تک اور کیوں؟

ہر مسلمان ان فرمودات کو سامنے رکھے اور ذرا سوچے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ خصوصاً خواتین جب ساس کا روپ دھارتی ہیں تو کیا کیا ظلم وستم نہیں ڈھاتیں‘ ہم لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ لڑکے کی شادی کے موقع پر لڑکے کی ماں کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور ایسے ایسے گن گائے جاتے ہیں کہ ساس صاحبہ کی گردن تن کر اکڑ جاتی ہے‘ مثلاً ’’شادی تاں رجدی جدوں نچے مُنڈے دی ماں‘ اعاذنَا اللّٰہُ مِنھَا۔ ایک شادی کے موقع پر میں نے خود یہ تماشا دیکھا کہ بارات آئی اور عین بیچ میں لڑکے کی ماں غرارہ پہنے ہوئے بے پردہ (حالانکہ پہلے وہ چادر اوڑھتی تھیں اور بہت مہذب خاندان سے ہیں) مووی کیمروں کے جلو میں اکڑتی ہوئی ہال میں تشریف لائیں۔ یوں لگا کہ آج انہوں نے ہر قسم کی حدود کے تمام بندھن توڑ دیے ہیں‘ گویا آج وہ ایک ماں کے بجائے ایک ڈکٹیٹر کا روپ دھار چکی ہیں۔ میں نے انہیں سلام کیا‘ چونکہ میں پردے میں تھی تو انہوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ان کا یہ روپ دیکھ کر جہاں مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور تعجب ہوا‘ وہاں یہ سوچ کر شدید دکھ ہوا کہ اس معاشرے میں ساس بننے کا عمل کتنا بھیانک ہے‘ الا ماشاء اللہ! (اس بارے میں‘ میں یہ وضاحت کر دوں کہ اُن کے شدید اصرار پر میں وہاں گئی تھی اور جب میں نے ابتدائی مناظر دیکھے تو میں وہاں سے فوراً واپس لوٹ آئی کیونکہ مجھ میں بعد کے مناظر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔)



ایک اچھے معاشرے کی ابتدا اچھے گھر سے ہوتی ہے اور اچھے گھر کا مطلب ہوتا ہے پُرسکون گھر۔ اور جہاں انسانوں میں ہی آپس میں غلامی کا تصور موجود ہو وہ معاشرہ کبھی بھی سنور نہیں سکتا اور نہ ہی پُرسکون رہ سکتا ہے۔ اس طرح کے چند ایک اور واقعات جو میری نظر سے گزرے اور میرے کانوں نے سنے ہیں‘ وہ میں ’’نصیحت اور عبرت‘‘ کے طور پر آپ کے گوش گزار کر رہی ہوں: (۱) ساس اور بہو ایک محفل میں آئیں۔ ساس صاحبہ بالکل ٹھیک ٹھاک‘ صحت مند تھیں اور تیز قدموں سے چلتی ہوئیں آگے تشریف لا رہی تھیں اور ان سے آگے تو ناممکن بلکہ چند قدم پیچھے بہو گود میں ایک بچہ اٹھائے‘ اپنا بڑا سا بیگ اٹھائے اور ساس کے دوپٹے کو بھی بہت احترام سے سنبھالے ہوئے بمشکل چلی آ رہی تھی! (۲) ساس صاحبہ سو رہی تھیں یا ویسے ہی آرام کر رہی تھیں تو بہو نے ان کے اوپر دوپٹہ نہیں دیا اور جوتے سیدھے کر کے نہیں رکھے تو اس پاداش میں وہ بیچاری شوہر کے ذریعے ستائی گئی! (۳) ساس صاحبہ محض اس وجہ سے بہو کے کمرے میں رات کو رہتی ہیں اور جاگ کر رات گزارتی ہیں کہ کہیں بیٹا بہو کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ پھر بہو دن کو بچوں اور گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے اور ساس رات کی نیند دن میں پوری کرتی ہیں! (۴) صرف بیٹیاں پیدا ہونے پر ساس نے بہو کو بیٹے سے طلاق دلوادی! (۵) بہو اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے ملک میں رہتی ہے اور ساس صاحبہ پاکستان میں‘ لیکن بیٹے اور بہو کی شہ رگ پر ساس صاحبہ کا ہاتھ بذریعہ فون رہتا ہے۔ (۶) ساس صاحبہ نے بہتان اور غلط سلط الزام لگا کر بیٹے کو اپنی طرف مائل کر لیا اور بہو کو کمرے میں تنہا کر دیا۔ بہو سے ہر قسم کی آسائشیں‘ یہاں تک کہ بچے تک چھین لیے گئے۔ بہو کا میکے آنا جانا بند کر دیا گیا اور کمرے میں اس کو بند کر کے قیدیوں کی طرح ایک روٹی اور سالن بھجوا دیا جاتا ہے —— یہ تمام واقعات سمجھ دار اور درس وتدریس سے وابستہ نیک گھرانوں میں ہو رہے ہیں اور جو بچیاں ستائی جا رہی ہیں‘ ان کا تعلق بھی دینی گھرانوں سے ہے۔

## مشترکہ فیملی نظام بمقابلہ بہو کا الگ گھر

اگرچہ یہ نہ ختم ہونے والی داستان ہے اور اعتراضات تو دو طرفہ اٹھائے جا سکتے ہیں کہ اگر ساس صاحبہ زیادتی کرتی ہیں تو بہو بھی کچھ کم انتقامی رویہ نہیں رکھتی‘ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب اسلام میں جوائنٹ فیملی سسٹم نہیں ہے تو پھر ایک ہی گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا کیوں ہوتا رہے اور اسے میدانِ کارزار کیوں بنا کر رکھا جائے؟ ہمیں اس بات کی سمجھ کیوں نہیں آتی کہ

محمد رسول اللہ ﷺ نے کوئی چھوٹا یا بڑا خیر ہمیں بتانے سے نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ بیت الخلاء کے بارے میں بھی ہماری رہنمائی فرمائی کہ اندر داخل ہوتے وقت پہلے کون سا پاؤں رکھنا ہے؟ کون سی دعا پڑھنی ہے؟ کتنے ڈھیلے پاکی کے لیے استعمال کرنے ہیں؟ کس پاؤں پر وزن ڈال کر بیٹھنا ہے تاکہ فراغت اچھی طرح ہو سکے؟ باہر نکلتے ہوئے کون سا پاؤں پہلے باہر رکھنا ہے اور کون سی دعا پڑھنی ہے؟ تو اگر اکٹھے رہنے میں کوئی خیر ہوتا تو کیا نبی کریم ﷺ ہمیں اس بات سے محروم رکھتے؟ اگر ہمارے اقوال کے مطابق اس قسم کے اتفاق میں برکت ہوتی تو نبی پاک ﷺ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو بھی اکٹھا ہی اتفاق سے رہنے کا درس دیتے‘ حالانکہ حضور ﷺ نے اپنی ہر زوجہ کے لیے الگ گھر بنایا۔

ایک اور بات ہمارے ذہنوں میں آ جاتی ہے کہ اگر جوائنٹ فیملی سسٹم میں کوئی خرابی ہوتی تو ہمارے نبی ﷺ اس سے روک دیتے۔ اس کا تو سیدھا سا جواب یہ ہے کہ عرب میں جوائنٹ فیملی سسٹم ہے ہی نہیں۔ چند اور سوالات اور اشکالات اس ضمن میں ہمارے ذہنوں میں کلبلاتے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ یہ ہیں: (۱) ساس سسر کی خدمت کون کرے گا؟ (۲) بیٹا ہم سے جدا ہو جائے گا! (۳) پوتے‘ پوتیاں ہمیں پہچان بھی نہیں پائیں گی۔ ذیل میں ہم ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

## ساس سسر کی خدمت کون کرے گا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے خودساختہ فرائض گھڑ لیے ہیں کہ بہو پر ساس سسر کی خدمت فرض ہے۔ حالانکہ بہو پر نہیں‘ بیٹے پر والدین کی خدمت فرض ہے جس کا نام بھی نہیں لیا جاتا۔ بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ بیٹا تو تھکا ہارا آتا ہے وہ کیسے والدین کی خدمت کرے گا۔ حالانکہ بیوی بھی سارا دن کام ہی کرتی رہتی ہے‘ آرام نہیں کرتی‘ لیکن اس کے فرائض میں ساس سسر کی خدمت کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہو پر ساس سسر کا خودساختہ فرض عائد کر کے ہم اللہ کو کیا جواب دیں گے؟ ہاں جو کام وہ کر دیتی ہے اس کے بدلے میں اس کو دعائیں دیں‘ اچھا اخلاق پیش کریں کہ وہ آپ پر احسان کر رہی ہے۔ کبھی ساسوں نے بھی ان پر احسان کیا ہے کہ جب وہ بیمار ہوں تو ان کو اپنے پاس رکھیں‘ ان کی خدمت کریں؟ کیا انسان ہونے کے ناطے ہم اور وہ برابر نہیں ہیں؟ ہمارے ہاں تو یہ رواج ہے کہ بہو کو اس کی بیماری میں میکے بھیج دیتے ہیں اور تندرستی کی حالت میں



میکے بھیجنا گوارا ہی نہیں کرتے‘ اس لیے کہ ڈر صرف اس بات کا ہے کہ کچن کون سنبھالے گا‘ ساس سسر کی خدمت کون کرے گا؟ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے فرائض کے بارے میں ہم سے ضرور پوچھ ہوگی۔ ہماری اولاد (بِن بیاہی) اور شوہر اصلاً ہماری ذمہ داری ہیں۔

## بیٹا ہم سے جدا ہو جائے گا!

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بہو کو الگ گھر لے کر دینے کی صورت میں بیٹا ہم سے جدا ہو جائے گا۔ اس کے جواب کے لیے یہ شعر کافی ہے ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے!

ہم نے بڑھاپے میں قدم ڈال دیے ہیں اور اب ہم زندگی کی نسبت موت سے زیادہ قریب ہیں۔ خدارا وہاں کی فکر کریں جہاں ہم خواہی نخواہی دھکیلے جا رہے ہیں۔ بیٹے بہو کی صورت میں ایک خاندان کو احسن طریقے سے پنپنے دیں۔ اپنے دل کو بیٹے اور اس کی اولاد میں لگانے کی بجائے آخرت کی بھیانک اور خوفناک منزلوں سے نبرد آزما ہونے کی طرف راغب کریں۔ اس میں بھی قصور ہم ماؤں کا ہے کہ ہم نے اپنے بیٹوں کو بچپن میں ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا کہ یہ ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہیں۔ نہ بچے کی اخلاق کی پروا کی‘ نہ ان کی اچھی تربیت کی اور نہ ان کو حقوق و فرائض سے آگاہی دی۔ یہ ہمارا بہت بڑا قصور ہے کہ ہم نے بیٹوں کو ان کے فرائض نہیں سکھائے۔ یہ سب کچھ تو ہم پہلے بیٹیوں اور پھر بہوؤں سے وصول کرتے ہیں۔ یہ الگ گناہ ہم سب کے سر ہے جس کی تلافی کی ہمیں خود فکر کرنی چاہیے۔ سوچیں‘ جو اللہ ہماری جوانی میں ہمیں کھلا پلا رہا ہے کیا وہ بڑھاپے میں ہمیں تنہا چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں! اللہ تو کہتا ہے کہ ”تم اگر اس پر توکل کرو تو وہ تمہارے لیے کافی ہو جائے گا“۔ (الطلاق:۳) ہم نے توکل اپنے بیٹوں پر کیا لہٰذا بیٹا چھن جانے کے ڈر سے ہم اس کا گھر اُجاڑنا پسند کرتے ہیں۔ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود بھی بسا اوقات بیٹے اپنی بیویوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں‘ کیونکہ وہاں بیویوں اور اولاد کی محبتیں ہیں اور یہاں والدین کے فرائض ہیں۔ فرائض کی ادائیگی میں اگر ہم نے کوتاہیاں کی ہیں تو ہماری اولاد کیوں نہیں کرے گی؟

البتہ بیٹوں کو ہرگز‘ ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ الگ ہو کر شاید ان کی ذمہ داری بھی کم ہو گئی ہے۔ ان پر والدین کے حقوق ادا کرنا فرض ہیں جن کی پوچھ اور مسئولیت اللہ کے ہاں بہت

زیادہ ہے‘ اس لیے کہ معروف اور جائز کاموں میں والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ میں شمار ہوتی ہے۔ کجا یہ کہ ہم ان کے ساتھ سخت رویہ رکھیں‘ بیوی بچوں کو زیادہ مقام عطا کریں اور والدین کو نظر انداز کریں۔ بیٹے کو چاہیے کہ وہ والدین کی تمام ضروریات خود پوری کرے اور ساس صاحبہ جو توقعات بہو سے رکھتی ہے‘ بیٹا وہی سب کچھ اپنے ذمے لے لے تو یہ معاملہ فی الفور ختم ہو جائے گا۔

## پوتے پوتیاں ہمیں پہچان بھی نہیں سکیں گی!

بیٹے کے الگ گھر میں چلے جانے سے ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ پوتے پوتیاں ہمیں پہچان نہ پائیں۔ اگر ہم احسن طریقے سے اپنے بیٹے کا گھر بسائیں‘ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ تلخیاں اور ناچاقیاں بڑھنے پر ہی بیٹے کو الگ کیا جائے بلکہ پیار‘ محبت اور سلوک‘ اتفاق سے بھی اپنے بیٹے کا گھر بسایا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں کوئی بھی الگ نہیں ہوتا۔ یقین کریں کہ بیٹا اور بہو‘ اور پھر ان کی اولاد‘ اور سب سے بڑھ کر خود ساس سسر بھی ایک دوسرے کے لیے ایثار وقربانی کرنے والے بن جاتے ہیں۔ ان محبتوں میں حسد و رقابت اور بدگمانیوں کی جگہ اللہ کی محبت آ جاتی ہے‘ کیونکہ ہم نے یہ سب کچھ اللہ کی محبت میں کرنا ہے اور کوشش کرنی ہے کہ ؎

ہر تمنّا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی!

یہ ضرور ہے کہ بیٹے کو اپنے فرائض (از روئے قرآن وحدیث) ضرور یاد کرائیں اور وہ بھی صرف اس احساس کے تحت کہ قیامت کے دن کہیں وہ ہمارا گریبان نہ پکڑ لے کہ اے اللہ میرے والدین نے مجھے ان فرائض سے آگاہ ہی نہیں کیا تھا۔ اس حوالے سے بھی نیت یہ نہ ہو کہ بیٹے کو فرائض سے آگاہی اس لیے دیں کہ بس بیٹا ہمارے سامنے رہے‘ ہماری خدمت کرے‘ ہمارے ساتھ زیادہ وقت صرف کرے۔ یہ یاد رکھیے کہ ہماری نیتوں کا بھی محاسبہ ہوگا اور ہمارے اعمال کا دارومدار بھی نیتوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ))۔ لہٰذا ہم یہاں جو بوئیں گے‘ قیامت کے دن وہی کاٹیں گے اور آخرت کے حوالے سے نبی پاک ﷺ کا یہ قول یاد رکھیں: ((اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْآخِرَۃِ)) یعنی اصل عیش اور راحت کی زندگی آخرت کی زندگی ہے جو کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔

## آخری بات

لڑکی کا الگ گھر اس کا حق ہے چاہے وہ لڑکی ہماری بیٹی ہو یا بہو۔ ہماری بیٹی ہو تو ہمیں



دل وجان سے قبول ہے کہ وہ الگ گھر میں رہے‘ لیکن اگر بہو الگ گھر کا مطالبہ کر دے تو اس کو رشتے کاٹنے والی کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ بعض خاندانوں میں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہو نے الگ گھر کا مطالبہ کیا تو سسرالیوں نے رات کے اندھیرے میں لڑکی کو گھر سے باہر نکال کر کھڑا کیا اور بچے بھی یا تو چھین لیے جاتے ہیں یا بچوں کو بھی اس کے ساتھ دھکا دے دیا جاتا ہے کہ نکل یہاں سے‘ بڑی آئی ہمارے رشتے کاٹنے والی۔ اور پھر لڑکی کے والدین کو فون کر دیا جاتا ہے کہ آ کے اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔

بہو الگ گھر کا مطالبہ کرتی ہے تو اگر استطاعت ہے تو ضرور الگ گھر لے دیں‘ احسان جتا کر نہیں بلکہ اللہ کا شکر ادا کر کے کہ اس نے ہمیں اس کا حق ادا کرنے کا موقع دیا‘ جیسے کہ سورۃ الدھر میں اللہ نے وہ اہلِ ایمان جو مستحقین کو کھلاتے ہیں‘ ان کے الفاظ نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ۝۹﴾

’’(اور وہ اہلِ ایمان کہتے ہیں کہ) ہم تو آپ کو یہ کھانا کھلا رہے ہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے‘ ہم نہ تو آپ سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکریہ۔‘‘

اصل میں انداز یہ ہونا چاہیے‘ لیکن اگر بہو بیٹے کو اپنے گھر میں ہی رکھنا ہے تو پھر فتنہ وفساد کی جگہ اسلام اور بداخلاقیوں کی جگہ خوش اخلاقیوں کو لے آئیں۔ پھر بہو بھی یہ ضرور سوچے کہ آج میں بہو ہوں تو کل کو میں ساس ہوں گی اور میں آج جو بوؤں گی‘ کل مجھے وہی کاٹنا پڑے گا۔ آج اگر میں صبر‘ قربانی‘ ایثار‘ انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا جذبہ اپنے اندر رکھوں گی تو دوہرا بلکہ تہرا فائدہ ہوگا:

(۱) اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہوں گے۔
(۲) بچوں کی تربیت اچھی بلکہ بہت اچھی ہوگی۔
(۳) شوہر کو بھی دونوں طرف کے حقوق ادا کرنے میں آسانی ہوگی اور مستقبل میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے اور جیسا کرو گے ویسا بھرو گے کے مصداق ہمارے ساتھ بھی اچھا ہی ہوگا۔

اگر بہو الگ گھر کا مطالبہ نہیں کرتی تو پھر بھی ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ یہ بہو کا شرعی حق ہے جو محفوظ ہے اور وہ جب چاہے لے سکتی ہے۔ الگ گھر کا مطالبہ کرنے پر نہ اس پر کوئی گناہ ہوگا اور نہ ہم ان کو الگ گھر دے کر ان پر کوئی احسان کریں گے۔ البتہ مانگنے پر بھی اس کا حق نہ

دیا تو فرائض کی عدم ادائیگی پر ہماری پکڑ اللہ کے ہاں ضرور ہوگی۔ اعاذنا اللّٰہ منہا! آج بہو کا یہ حق مار کر دنیا میں اس کی نقد سزا ہم اپنی آنکھوں سے گھروں میں لڑائی جھگڑے کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں‘ جبکہ آخرت میں تو اس کی دوطرفہ پکڑ ہوگی۔ ایک تو بیٹوں کو ان کے فرائض سے آگاہ نہ کرنے پر‘ دوسرے بہو پر ناجائز اور خودساختہ فرائض ٹھونسنے پر۔ ابھی مہلت عمر باقی ہے تو انصاف کے تقاضے پورے کرنے شروع کریں۔ نہ جانے کون سا لمحہ آخری ثابت ہو‘ لہٰذا ہم اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ ہم ساسوں میں کون سی محبتیں زیادہ ہیں اور اللہ کی محبت کتنی ہے؟ اللہ کی محبت اور اس کا حکم اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت غالب ہے تو یقیناً خوشخبریاں ہیں‘ ورنہ ہم مفلس ونادار ثابت ہوں گے۔ اعاذنا اللّٰہ منہا!

پاکستانی معاشرے میں ناگوار سمجھے جانے والے دو کام —: (۱) پہلی بیوی کی موجودگی میں مرد کی دوسری شادی‘ (۲) لڑکی کے علیحدہ گھر کا مطالبہ — جائز تو ہیں‘ لیکن دونوں کو خراب کرنے اور ناگوار بنانے میں ہاتھ عورت کا ہی ہوتا ہے۔ پہلے کام میں بھی عورت کا انتقامی رویہ شوہر کے ساتھ انتہا کو پہنچا ہوتا ہے اور دوسرے کام میں بھی عورت ہی الگ گھر کا مطالبہ کرنے والی‘ الگ گھر نہ ملنے کی صورت میں گھر اجاڑنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کی تربیت اچھی کریں اور ان کو حقوق وفرائض سے آگاہ بھی ضرور کریں۔

## ایک آسان حل

ہم اگر اپنے بیٹوں کو الگ گھر نہیں دے سکتے اور آج کی مہنگائی کے دور میں بیٹے بھی اپنا گھر نہیں بنا سکتے تو ان سارے مسائل کا ایک بہت عمدہ حل یہ بھی ہے کہ شادی کے موقع پر بے جا اخراجات اور فضول خرچیاں کرنے کے بجائے ہم وہ پیسے اس کے کچن بنانے پر لگا دیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ جیسے اٹیچ باتھ کمروں کے ساتھ بنائے جاتے ہیں ایسے ہی کچن بھی کمروں کے ساتھ بنائے جائیں تاکہ پہلے دن سے باتھ روم کی طرح کچن بھی الگ ہو۔ کافی عرصہ پہلے باتھ روم بھی تو پورے گھر میں کچن کی طرح ایک ہی ہوتا تھا‘ لیکن اب یہ ناممکن ہے کہ بیٹے کا کمرہ بنایا جائے اور باتھ روم نہ بنایا جائے۔ اسی طرح اگر باتھ روم کے ساتھ کچن بھی بنا دیا جائے تو معاملات کافی حد تک درست سمت میں چل سکتے ہیں۔

❀❀❀

# ذُوالقرنین' سدِّ ذُوالقرنین اور --- یاجوج ماجوج (۷)

شاہین عطر جنجوعہ

سوال یہ ہے کہ اس سب ابتلا ومصیبت واخراج کے باوجود ازمنۂ وسطیٰ (500ء سے 1500ء) کے مغربی عیسائی علاقوں کی یہودی آبادی نہ صرف برقرار رہی بلکہ بڑھتی رہی' اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عیسائی مغرب میں کچھ عوامل ایسے تھے جو نہ صرف یہودی موجودگی کو تحفظ دیتے تھے بلکہ ان کی موجودگی کو بڑھانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

سب سے اہم عنصر یورپ کے سیکولر حکمران تھے جو یہودیوں کو یورپ میں لانے میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ کلیسا کے نظریات وخیالات کے برعکس سیکولر حکمران اپنے مملوکہ علاقوں کے مادی حالات اور اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے تھے۔ ان پر یہودیوں سے متعلق عقائد اور قوانین (کلیسا کے جاری کردہ) کی ہتھکڑیاں نہیں لگی تھیں۔ سیکولر عناصر ماحول اور علاقے کے دنیاوی فرق وتفاوت اور نشیب وفراز' جو پورے یورپی براعظم میں بڑے نمایاں تھے' سے غافل نہیں ہو سکتے تھے۔ علاقائی فرق وتفاوت نے مختلف علاقوں کی یہودی آبادیوں پر متنوع اثرات ڈالے۔

یورپ کا جنوبی یعنی بحیرۂ متوسطہ کا شمالی ساحلی علاقہ (اٹلی' فرانس وغیرہ) پوری طرح رومی تہذیب میں ضم ہو چکا تھا۔ شمالی یورپ (پولینڈ' ہنگری) وغیرہ کی صورت حال مختلف تھی۔ وہاں پہلے سے موجود کوئی یہودی آبادی تھی ہی نہیں۔ پھر یہ علاقہ خود ہر لحاظ سے پس ماندہ تھا۔

☆ ''بحث ونظر'' کے عنوان سے شائع شدہ مضامین کے مندرجات سے ادارۂ میثاق کا اتفاق ضروری نہیں۔ وضاحت طلب امور کے لیے صاحبِ مضمون سے رابطہ کیا جا سکتا ہے:

(فون: 03345080530) ای میل: shaeenattar@yaho.com



ان علاقوں کے حکمرانوں کے لیے (جو عیسائیت میں کم ہی دلچسپی رکھتے تھے)' یہودی تارکین وطن (immigrants) معاشی ترقی اور سرگرمی وگہماگہمی کا اوّل اور اہم ترین ذریعہ تھے (کیونکہ یہود تجارت اور مالی لین دین میں زیادہ مہارت اور شغف رکھتے تھے) اس کا سب سے اہم ثبوت 1084ء میں Speyer (غالباً پولینڈ کا علاقہ) کی یہودی آبادی کا قیام ہے۔ خوش قسمتی سے آبادی کی بنیاد رکھنے والی دستاویز اور اس پر یہودی رائے دونوں دریافت شدہ اور محفوظ ہیں۔ Speyer کے بشپ نے 1084ء کے چارٹر میں واضح بتایا کہ اپنے قصبے کی معاشی بہتری یہودیوں کو چارٹر دینے کا سبب بنی۔ (قول) ''جب میں نے اپنے گاؤں (Speyer) کو قصبہ بنانے کا سوچا تو میں Rudiger, surnamed Huozmann' جو کہ Speyer کا بشپ ہوں' نے سوچا کہ ہمارے قصبے کی شان ہزار گنا بڑھ جائے گی اگر میں یہاں یہودیوں کو آباد کر دوں (یعنی ترقی کر کے غالباً؟ لہٰذا بشپ نے یہ اجازت نامہ جاری کیا) اس سے واضح ہے کہ شمال میں یہودیوں کی آمد کا فائدہ معاشی فائدہ تصور کیا جاتا۔

بارہویں صدی میں ادھر مغربی یورپ میں کلیسا کے اصلاحی جذبے میں عیسائی کا عیسائی کو سود دینا ممنوع ٹھہر گیا تو تیزی سے ترقی کرتے مغربی عیسائی ممالک کو سرمایہ تو درکار تھا۔ یہ مرحلہ یہودیوں کے لیے ایک اہم معاشی موقع تھا' کیونکہ ان کے ہاں غیر یہودی (یعنی عیسائی وغیرہ) سے سود لینا دینا منع نہیں تھا۔ مزید یہ کہ وہ پہلے ہی اس کام میں ملوث تھے' وہ تیزی سے اس خلا کو پُر کرنے آگے بڑھے۔

متذکرہ بالا چارٹر جو 1084ء میں (پولینڈ کے) یہودیوں کو دیا گیا' کا 1244ء کے آسٹریا میں یہودیوں کو دیے گئے چارٹر سے موازنہ کیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈیڑھ صدی میں کتنا فرق آ گیا تھا۔ ایک طرف Speyer کے چارٹر میں یہودیوں کو اجازت تھی ''سونے کو چاندی سے بدلنے کی اور جو چاہیں خریدنے اور بیچنے کی'' دوسری طرف آسٹریا کے 1244ء کے چارٹر میں یہودیوں کے لیے تیس (30) فائدہ مند شرطیں تھیں جن میں سے دس (10) یہودیوں کے سودی لین دین کے معاملات کے متعلق تھیں۔ اس سے بلاشک وشبہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی کے آسٹریا اور آسٹریا کے چارٹر کی مثل پر پولینڈ اور ہنگری کی معیشت کی بنیاد یہودی سودی معاملات تھے۔

دوسری طرف مغربی عیسائی یورپ کے ملک انگلینڈ اور فرانس وغیرہ میں یہودیوں نے سودی قرضے کی زیادہ نفع بخش اور جدید قسم شروع کر دی۔ ان علاقوں کا عیسائی ہونے کے باوجود یہودیوں کو اس طرح کے معاملات کی چھوٹ دینا‘ درحقیقت سیکولر مقتدرہ کی دنیاوی ضرورتوں کا شاخسانہ تھا۔ اس نفع بخش شکل میں زمین collateral کے طور پر فنڈز کی فراہمی کی شرط میں شامل کی جانے لگی۔ اس شکل میں یہودی قرض دیتے وقت زمین براہِ راست قبضے میں نہیں لے سکتے تھے۔ اس قسم کی پریکٹس میں زیادہ بڑی رقم قرض دی جا سکتی تھی اور زیادہ فائدہ بھی ہوتا۔ لیکن اس کے لیے طاقتور حکومت کی پشت پناہی درکار رہتی۔ کیونکہ اگر (قرض خواہ) دیوالیہ ہو جاتا تو یہ صرف ذمہ داران تھے جو یہودیوں کے لیے collteral زمین کی ملکیت کا حصول یقینی بناتے۔ اس طرح کے قرضے حکمران طبقے اور یہودیوں کے درمیان تعلقات کو زیادہ مضبوط بنا دیتے۔ اس طرح حکمران نہ صرف یہودیوں کو تحفظ فراہم کرتے بلکہ ان کے کاروبار کے لیے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوتے۔

اس سودخوری کی وجہ سے مغربی عیسائیت بہت ترقی یافتہ ہو گئی لیکن ساتھ ہی یہودی اقلیت بہت امیر بھی ہو گئی۔ یہود کے ادلتے بدلتے حالات سبق آموزی کا ذریعہ ہیں کہ کیسے ایک تباہ شدہ قوم / نسل / قبیلے کو زمانے کے تھپیڑے کھانے پڑتے ہیں۔ اس مختصر سی تاریخی روداد سے ہمیں نزولِ قرآن کے وقت تباہ شدہ قوم یہود کے قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد اور پندرہویں صدی عیسوی تک کے حالات کا اجمالی نقشہ تازہ اور ذہن نشین ہو جاتا ہے:

(1) مختلف مغربی عیسائی علاقوں میں متنوع اتفاقات کی وجہ سے آبادکاری کے مواقع
(ا) اپنی تجارتی مہارت کی وجہ سے
(ب) علمی‘ فکری‘ تکنیکی اور فنی سرگرمی کی وجہ سے
(ج) سودی لین دین کی وجہ سے
(د) عیسائی مذہب کے ساتھ کچھ مناسبت کی وجہ سے

(2) مغربی عیسائی علاقوں میں بسا اوقات‘ استحصال‘ استیصال‘ ذلت‘ خواری اور دربدری کی مصیبتوں کا شکار رہے‘
(ا) واحد غیر مذہب اقلیت ہونے کی وجہ سے
(ب) عیسائیوں کے ذاتی‘ یا ملکی مفادات میں مذہب کے داخل کر دیے جانے کی وجہ



سے‘ یعنی ان پر‘ نعوذ باللہ‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قاتل اور سازشی ہونے کے الزام کو بار بار استعمال کر کے
(ج) عوام کے تصور میں طاقتور‘ امیر اور سیکولر حکمرانوں کا دوست ہونے کی وجہ سے
(د) بعض اوقات کسی حکمران کی اپنی ذاتی سیاسی مجبوری کی وجہ سے

اس دوران یورپ قدیم رومی سلطنت سے ٹوٹ کر قومی ریاستوں اور قومی ریاستیں قدیم جاگیرداری سے جدید سرمایہ داری کے نظام کی طرف منتقل ہو گئیں۔ لیکن جدید سرمایہ داری یک دم نمودار نہیں ہوئی اور نہ فوری عالمگیر غلبہ حاصل کر سکی‘ بلکہ تقریباً پندرہویں صدی سے شروع ہو کر مزید چار سو صدیوں کی کشمکش اور اس دوران چند اہم انقلابی تبدیلیوں کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ معیشت کا نظام عالمی وسعت حاصل کرتا گیا۔ چونکہ ہمارے موضوع یعنی یاجوج ماجوج اور یہود کا ایک پہلو جدید سرمایہ دارانہ معیشت کے نظام کو سمجھ لینے سے واضح ہو گا‘ لہٰذا ان عوامل‘ جن کی وجہ سے سرمایہ دارانہ معیشت وجود میں آئی اور تیزی سے پھیلی‘ کا تذکرہ ضروری ہے۔

قدیم جاگیردارانہ (Manorial) نظام‘ سرمایہ داری (Capitalism) کو روکنے میں مختلف طریقوں سے رکاوٹ بنتا ہے۔

(1) کیونکہ مزارع (serf) اپنے آقاؤں (lords) کے لیے کاشت/پیداوار حاصل کرتے تھے‘ لہٰذا انہیں technology (تکنیک) سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔
(2) کیونکہ مزارع (serf) اپنے خاندان کو زندہ رکھنے کے لیے کاشتکاری کرتے تھے لہٰذا انہیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
(3) چونکہ lords زمین کے مالک ہوتے تھے لہٰذا وہ وافر خوراک کے لیے طاقت (فوج/جنگجو) کا استعمال کرتے تھے۔
(4) چونکہ lords کسی مارکیٹ میں فروخت نہیں کرتے تھے‘ لہٰذا انہیں کسی قسم کا مسابقتی (competitive) دباؤ (pressure) نہیں تھا کہ ایجادات کریں۔
(5) چونکہ lords اپنی طاقت اور دولت فوجی ذریعوں سے بڑھاتے‘ اس لیے وہ اپنی دولت فوج (military)‘ اسلحے وغیرہ پر دکھلاوے کی سرگرمی میں‘ جس سے وہ دوسرے جاگیرداروں سے اتحاد بناتے‘ پر خرچ کرتے‘ اس لیے انہیں پیداواری ٹیکنالوجی

(Production tehcnology) بنانے میں سرمایہ لگانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

**جاگیرداری نظام کا تجارت میں رکاوٹ بننا:** تاجر اصلاً جاگیرداری کے تحفظ میں اور جاگیردار کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اشیاء فراہم کرتے۔ وہ کبھی بھی جاگیردار سے بے نیاز ہو کر اپنی تجارتی سرگرمی جاری نہیں رکھ سکتے۔ وہ تحفظ اور صارف دونوں کھو دیتے اگر وہ جاگیردار سے تعلق توڑتے۔ نتیجتاً ان کی سرگرمی جاگیردار کے فائدے سے زیادہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی جاگیردار انہیں زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع دیتے۔ لہٰذا تجارت بھی جاگیردار کے مقابلے میں برابری تک نہ پہنچ سکی۔

تجارتی اور صنعتی سرمایہ داری کے یورپ میں ظہور کے تاریخی عوامل کچھ یہ ہیں۔

اس قدیم جاگیردارانہ سرمایہ داری کے نظام میں یورپ کے چودھویں (14) صدی کے demographic بحران کی وجہ سے تبدیلی آئی۔ وہ بحران ان اسباب سے ظاہر ہوا:

(1) زرعی (agricultural) پیداواری مقدار اپنی حدوں کو پہنچ گئی اور مزید بڑھنا بند ہو گئی۔

(2) برے موسم کی وجہ سے 1315-17 کا عظیم قحط برپا ہوا۔

(3) Black death (غالباً طاعون) (1348-58) کی وجہ سے آبادی کا بڑے پیمانے پر اتلاف ہوا۔

اس سے زرعی پیداوار میں کمی ہو گئی۔ اس پر جاگیرداروں نے جنگ کر کے رقبات بڑھا کر زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے مزارعین سے مزید فوجی اخراجات کا خرچ اینٹھا۔ اس پر انگلینڈ میں مزارعین نے بغاوت کر دی۔ کچھ قصبوں میں چلے گئے‘ کچھ نے زمین خریدی اور کچھ ان زمینداروں سے ٹھیکے میں شامل ہو گئے جنہوں نے زمین کو مجبوراً کرائے پر چڑھایا تا کہ اپنے رقبہ جات کو آباد کریں۔ اس جاگیردارانہ نظام کی بربادی سے مزارع کاشت کار کی ایک ایسی کلاس وجود میں آئی جنہیں اپنی اشیاء کو بیچنے کی زیادہ آزادی تھی۔ لہٰذا ظاہر ہے‘ انہی کو technology میں خرچ کرنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

وہ آقا جو کرائے یا ٹھیکے پر انحصار نہیں کرنا چاہتے تھے‘ زمین مزارع کاشت کار (tenant formers) کو فروخت کر دیتے تھے یا انہیں خارج کر دیتے تھے اور آزاد مزدور کو بھرتی کرتے‘ جس پر انہیں پیداوار میں سرمایہ لگانا پڑتا۔ (باقی صفحہ 64 پر)




# کُلّیۃ القرآن لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

191-اے، اتاترک بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

رجسٹرڈ والحاق شدہ: وفاق المدارس العربیہ پاکستان۔ کوڈ 09565

درس نظامی کے ساتھ ساتھ میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے خواہش مند طلبہ کے لیے درجہ اولیٰ و جماعت نہم میں

## داخلے شروع

**خصوصیات**
- ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے وظائف
- قیام و طعام کی سہولت
- وفاق المدارس العربیہ اور
- لاہور بورڈ/پنجاب یونیورسٹی کا نصاب

**اہلیت**
- آٹھویں جماعت پاس
- عمر 13 تا 15 سال
- حفاظ کے لیے عمر میں ایک سال کی رعایت
- صرف پاکستان کے شہری

**شیڈول برائے داخلہ**

| | |
|---|---|
| پراسپکٹس اور داخلہ فارم | 10 مارچ 2015ء سے دستیاب |
| داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ | 3 اپریل 2015ء |
| ٹیسٹ/انٹرویو | 4 اپریل 2015ء، صبح 9 بجے |
| کلاسز کا آغاز | 6 اپریل 2015ء |

**المعلن:** پرنسپل کلیۃ القرآن، اتاترک بلاک، نیوگارڈن، لاہور

رابطہ: 042-35833637 0301-4882395

Apr. 2015
vol. 64

Regd. CPL No. 115
No.4

# Monthly Meesaq Lahore